سازِ مغرب

(اردو آہنگ میں)

حصہ پنجم

مرتبہ

حسن الدین احمد

وِلا اکیڈمی حیدرآباد

سازِ مغرب

(اُردو آہنگ میں)

حصّہ پنجم

مُرتّبہ

حسن الدّین احمد

ولا اکیڈمی حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات ولا اکیڈیمی (۳۶)

زمانہ اشاعت ______ جولائی ۱۹۷۸ء

تعدادِ اشاعت ______ ایک ہزار

طباعت ______ کوہ نور پریس دہلی ۶

کتابت ______ عبدالصبور خاں

قیمت ______ بیس ۲۰ روپیہ

ناشر

ولا اکیڈیمی

ملنے کا پتہ

ولا اکیڈیمی، عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

ترتیب

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں

حصّہ اول میں موجود ہیں

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں

حصّہ اول میں موجود ہیں

ابتدائی باتیں

منظوم ترجموں کے انتخاب کے پراجکٹ کے سلسلے میں یہ بات مرتب کے لئے موجب طمانیت ہے کہ اس سلسلے میں کئے گئے سارے اندازے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسا قیمتی مواد دستیاب ہو رہا ہے کہ اس عظیم کام کا پھیلاؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس لئے اب ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اس کام کی تکمیل کتنی جلدوں میں ہوگی اس کا تعین نہ کریں لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ انگریزی سے کئے گئے منظوم ترجموں کا بڑی حد تک احاطہ کر لیا گیا ہے اور سازِ مغرب کا پانچواں حصّہ جو دلّی اکیڈمی کی چھتیسویں پیش کش ہے اہلِ ذوق کی خدمت میں پیش ہے۔ اس مرتبہ ۷۷ منظوم ترجمے پیش ہیں جن میں ۱۵ سابق میں پیش کی گئی نظموں کے ہم ترجمے ہیں۔ اہلِ اردو نے سازِ مغرب کی جو قدر افزائی فرمائی اس سلسلے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔

جن علم دوست حضرات نے منظوم ترجموں کی فراہمی اور سازِ مغرب کی طباعت کے سلسلے میں مدد فرمائی ان سب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں خاص طور پر اپنے دیرینہ کرم فرماؤں نواب سید مظفر الدین خاں صاحب اور جناب سید ظہور حیدر زیدی صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ابتداء ہی سے اس پراجکٹ میں پرخلوص تعاون فرمایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ دہلی کے لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جن کی خاص دلچسپی اس پراجکٹ کے شامل

حال ہے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی اور کام سے لگن اس لائبریری کی ترقی کی ضامن ہے۔ البتہ ان کے رفقاءِ کار سے میں نے کہہ دیا ہے کہ ان کا شکریہ تب ہی ادا ہوگا جب وہ قابلِ لحاظ میں منظوم ترجموں کی نشاندہی کر کے خود کو شکریہ کا مستحق ثابت کریں گے۔

ایک جذبۂ تشکر اور بھی ہے

مجھے اپنی بے مائیگی کا احساس پوری شدت کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب مجھ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ میں نے اتنے سارے منظوم ترجمے کیسے اور کہاں کہاں سے فراہم کرلئے میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے اس پراجکٹ پر کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ اور میں اکیلا ہی خلوص اور انہماک سے منزل کی جانب چل پڑا پھر جانے انجانے متوقع اور غیر متوقع لوگ ملتے گئے۔ گویا یہ سب کسی مقررہ پروگرام کے تحت ہو رہا ہو ملاقاتیں ہوئیں۔ حوالے دیئے گئے۔ نشاندہیاں ہوئیں۔ مشورے ملے مراسلتیں ہوئیں۔ سفر ہوئے، کتب خانوں کی حاضریاں ہوئیں۔ قدیم رسالوں اور کتابوں کی ورق گردانیاں ہوئیں۔ کتنی ہی کتابوں میں پہلی مرتبہ ورق کو ورق سے جدا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ دن میں وقت نہ ملا تو راتوں کی نیندیں اچاٹ ہوگئیں۔ غرض اس شان سے چیزیں جمع ہوتی گئیں۔ یہ سب اہتمام جس "کسی" نے کیا اس کے لئے ایک خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ وہ جذبہ کیا ہے؟ بعض جذبات بیان کئے جا سکتے ہیں، بعض الفاظ کی کثافت کو نہیں سہہ سکتے صرف محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ بعض تو اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ احساس بھی ان کی تاب نہیں لاسکتا جن کا مقام آنکھوں کی نمی ہوتا ہے میرے اس جذبہ کا مقام بھی آنکھوں کی نمی ہے۔

حسن الدین احمد

سی ۷، ۳۰ کرزن روڈ، اپارٹمنٹ، نئی دہلی۔

جولائی ۱۹۷۸ء

اقبال سہیل

موسمِ گرما کا آخری گلاب

یہ کھلا ہے ختمِ بہار پر، جو چمن کا غنچۂ آفریں
ہے عجب منظرِ بے کسی، کوئی اہلِ بزم نہ ہمنشیں
جو کھلے تھے پھول وہ جھڑ گئے، جو رفیق تھے وہ بچھڑ گئے
گُلِ نو شگفتہ کوئی نہیں، کوئی ناشگفتہ کلی نہیں

کوئی غمگسار نہ ہم نفس نہ بہارِ حسن کا نکتہ رس
سنے کون شکوۂ بے کسی، کہے کون اداؤں پہ آفریں
یہ ہجومِ جلوۂ رنگ و بو، یہ فروغِ چہرہ آتشیں
یہ جمال اور یہ بے کسی یہ شباب اور یہ دلِ حزیں

تجھے گھلنے دوں گا نہ اس طرح ہیں غمِ فراقِ بہار میں
ترے دوست کنجِ عدم میں ہیں وہیں جاکے تو بھی ہو اب مکیں
ترے حال پر ہے یہی کرم کہ بکھیر دوں ترا ہر ورق
اسی فرشِ خاک پہ جس جگہ پڑے سوتے ہیں ترے ہمنشیں

یونہی جب کہ خاتم عشق کا گرے رفتہ رفتہ ہر اک نگیں
چمن وفا و خلوص کا ہو فسردہ ہر گل نازنیں
کوئی ہم صفیر اگر نہ ہو تو نوائے عیش حرام ہے
کوئی ہم پیالہ اگر نہ ہو تو شراب مرگ ہے انگبیں

اقبال سہیل

موسمِ گرما کا آخری گلاب

گرمیوں کا یہ آخری ہے گلاب
جو اکیلا کھلا ہے گلشن میں
غنچہ و گل جو اس کے تھے احباب
جا چھپے سب فنا کے دامن میں
حُسن کی شوخیاں دکھائے کسے
اب حریفِ ادا کوئی نہ رہا
دل کی بے تابیاں سُنائے کسے
دلِ درد آشنا کوئی نہ رہا
اس طرح شاخ پر بہ حالِ خراب
میں نہ چھوڑوں گا تجھ کو فرقت میں
تیرے ساتھی ہیں محوِ راحت خواب
تو بھی جا اب ان ہی کی صحبت میں

غرض اب تجھ پہ مہربان ہوکر
میں بکھیروں گا تیری پنکھڑیاں
بس اسی خواب گاہ راحت پر
سو رہے ہیں تیرے رفیق جہاں
یونہی اخلاص کے گلستاں سے
جب کہ رخصت ہو ہر گل رنگیں
انس کے حلقۂ درخشاں سے
جب کہ گر جائیں تابناک نگیں
جب محبت کے پھول مرجھائیں
ہم بھی رخصت ہوں بزم فانی سے
چاہنے والے جب نہ رہ جائیں
موت بہتر ہے زندگانی سے

اقبال سہیل

موسمِ گرما کا آخری گلاب

یہ موسمِ گرما کا گل باز پسیں ہے
اب باغ میں اس کا کوئی ہم بزم نہیں ہے

تھا جو بھی چمن زاد وہ دنیا سے سدھارا
بے چارہ یہی رہ گیا تقدیر کا مارا

ہمدم کوئی باقی ہے نہ ہمراز کوئی ہے
اجڑا ہے چمن پھول ہے کوئی نہ کلی ہے

لے کون اب اس خندۂ رنگیں کی بلائیں
اب پنکھڑیاں چاک جگر کس کو دکھائیں

یوں شاخ پہ تنہا تو نہ چھوڑوں گا تجھے میں
ہاں اے گلِ حسرت زدہ توڑوں گا تجھے میں

تیرے رفقاء محو ہیں سب خوابِ عدم میں
جا تو بھی وہیں صحبتِ اربابِ عدم میں

میں بے کسی حسن پہ احسان کروں گا
شیرازہ تیرا آج پریشان کروں گا
ساتھی ترے جس فرش پہ سوتے ہیں پس مرگ
پائیں گے سکوں جا کے وہیں اب ترے گلبرگ

جب غنچہ جمعیتِ احباب ہو برہم
جز موت نہیں زخمِ جگر کا کوئی مرہم
گرنے لگیں جب خاتم الفت کے نگینے
بجھ جائیں جو آتش کدۂ عشق میں سینے

اٹھ جائیں جب اس بزم سے سب چاہنے والے
دنیا سے مجھے بھی میرے اللہ اٹھا لے

ہمزہ ترجمے حصہ دوم ۱۳۴ حصہ سوم صفحات ۱۳، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۱ اور
اس حصے میں صفحہ ۱۱، ۱۳ پر دیکھیے۔

محمد عثمان عارف نقشبندی

محبت کا فلسفہ

چشمے پانی کے تو دریا سے ملے جاتے ہیں
اور دریا کی سمندر سے ہم آغوشی ہے
وصل کے جوشِ مسرت کا سہارا لے کر
باغِ جنت کی ہوائیں بھی گلے ملتی ہیں
بزمِ دنیا میں نہیں کوئی اکیلا تنہا
ہے ہر اک چیز کا ہر چیز سے ربط باہم
عام ہے عام جہاں پیار ملن کا جذبہ
کیوں نہ میں خود کو تری ذات میں گم کردوں
روز و شب دیکھ گگن چومتے رہتے ہیں پہاڑ
اور لہریں بھی بغل گیر ہوئی جاتی ہیں

پھول پھولوں سے نہ ہنس لیں جب تک

مانو قائم نہ رہے بھائی بہن کا رشتہ

کرنیں خورشید کی لیلائے زمیں کو چومیں

چاندنی بحر کے آغوش میں کیسی مچلے

کتنا بے معنی و مقصد رہے یہ بوس و کنار

تو نہ گر وصل کی لذت سے نوازے

مظفرالدین خاں صاحب

پریت کی ریت

جو چشمے ہیں وہ ابل کر ندی سے ملتے ہیں
سکوں ندی کی میسر کنارِ بحر میں ہے
ہوائیں دوڑ کر سینے سے لگ جاتی ہیں آپس میں
جہاں دیکھا تہِ بامِ فلک ہم جنس کو اپنے

•

یہی قانونِ قدرت ہے یہی قانونِ فطرت ہے
نہیں پیدا کیا آدم کو بھی اللہ نے تنہا
مری آغوش کو آباد تو پھر کیوں نہیں کرتی؟

بوسہ افلاک نے جھک کر لیا کہساروں کا
موج سے موج ہم آغوش سمندر میں ہوئی
لب بلب غنچے ہیں اور سینہ بسینہ گل ہیں

کرۂ ارض سے سورج کی شعاعیں لپٹیں
چاند بھی تو لب دریا کو بہت چوما ہے
ان حسیں بوسوں کی کچھ بھی نہیں قدر و قیمت
مٹے ترے ہونٹوں کی مدہوش نہ کردے جب تک

ہمترجمے حصہ اول صفحہ ۹۳ حصہ دوم صفحات ۸، ۷، ۹ حصہ سوم صفحہ ۹۶ حصہ چہارم صفحہ ۶۳۔ اور اس حصے میں صفحہ ۱۷ پر دیکھئے۔

محمد عثمان عارف نقشبندی

نابینا شاعر

آہ جب زندگی آدھی بھی بسر ہو نہ سکی
بے کراں عالمِ تاریک میں چھینی مجھ سے
کون سے جرم میں آنکھوں کی بصارت میری
آہ! وہ جوہرِ شعری کہ مری موت پہ پردہ ڈالے
دفن بے مقصد و بے سود ہے میرے دل میں
گو میری روحی تمنا ہے کہ خالق کے حضور
نذر یہ تو کروں ازراہِ خلوص و خدمت
کتنی حسرت ہے مجھے حشر کے ہنگامے میں
اپنے اعمال کا سچائی سے دینا ہے جواب
کہیں ایسا نہ ہوں معتوب ہوں ڈانٹا جاؤں
پیار سے دل میں ابھرتا ہے یہی ایک سوال؟
کیا خداوند کو درکار ہے خدمت دن بھر؟

ایسے معذور سے روتا ہے جو بینائی کو
منہ ہی منہ میں جو شکایت ہے دبا دیتا ہے
جذبۂ صبر و اطاعت اسی احساس کے ساتھ
بے نیاز اور مبرّا ہے خدا ان باتوں سے
خدمتِ خلق کی نذریں ہوں کہ تحفے خود کے
اُس کی خدمت تو حقیقت میں ہے طاعت اسکی
اس کا دربار وہ دربارِ شہنشاہ ہے
سینکڑوں اُس کے اشارے پہ ہیں سرگرم عمل
بحر و بر میں نہیں دم بھر جہاں آرام کا نام
اُن کی خدمت بھی تو مقبول حضورِ حق ہے
منتظر ہیں جو کھڑے اُس کی اطاعت کے لئے

فضلُ الرحمٰن

اندھا شاعر

روز روشن پہ مرے ظلمت شب چھائی ہے
اندھی آنکھوں کا ہے رونا غم بینائی ہے
جو ہر شعر جو ہستی سے عبارت ہے مری
جس زر نقد سے محرومی ہلاکت ہے مری
سو جتن کر کے پئے نذر عقیدت جس کو
جمع کرتا ہوں سمجھتا ہوں عبادت جس کو
مانگے مالک جو مری عمر دوروزہ کا حساب
یہی مجموعہ ہو خالق کے سوالوں کا جواب
سوچتا ہوں جو ترستا ہو بصارت کے لئے
کیا وہ موزوں ہے خداوند کی خدمت کے لئے

گرچہ مستغنی ہے انساں کی ریاضت سے خدا
بے نیاز اپنے کرم خلق کی منت سے خدا
شان شاہانہ اور مہہ پہ حکومت اس کی
ہے وہ خادم جو کرے دل سے اطاعت انکی
کچھ تگ و دو میں ہیں بندے تو استادہ ہیں
حکم حق سب کے سر آنکھوں پہ سب آمادہ ہیں

جنت الفردوس

ذکر جنّت کا سُنا ہے تیرے منہ سے اکثر
واں کے بچّوں کو تو کہتی ہے گروہِ خوش تر
پیاری اماں! وہ فرح بخش زمیں ہے کس جا
ڈھونڈ کر اس کو نہ ہم دور کریں غم اپنا
کیا وہ واں ہے گلِ نارنج ہے جہاں کھلتا
یا جہاں مہندی کی شاخوں پہ ہے جگنو اڑتا؟
وہ نہیں واں وہ نہیں واں میرے پیارے بچّے

کیا وہ واں ہے جہاں اُگتے ہیں شجر خرمے کے
خرمے پکتے ہیں جہاں چرخِ منوّر کے تلے
یا جھلکتے ہوئے بحروں کے جزیروں کے میاں
بوئے گل باد نیں گل زار بساتے ہیں جہاں
اور مرغانِ نوا سنج و نوادر خوش رنگ
اپنے پر رکھتے ہیں رنگین مثالِ اژ رنگ
وہ نہیں واں وہ نہیں واں میرے پیارے بچّے

کیا کسی خطۂ دیریں میں ہے واقع وہ زمیں
ریگِ زرّیں پہ جہاں بہتی ہیں نہریں سیمیں
لعل و یاقوت ہیں چمکاتے شعاعیں روشن
اور کرتا ہے جہاں کان کو ہیرا روشن
موتی مرجاں کے جزیروں سے نکلتے ہیں جہاں
کیا وہاں ہے میری اماں وہ زمین شاداں
وہ نہیں واں وہ نہیں واں میرے پیارے بچے
آنکھ نے ہے نہ تو دیکھا اسے پیارے بچے
کان نے ہیں نہ سنے اس کی خوشی کے نغمے
خواب دکھلا نہ سکے ایسا فضا بخش جہاں
موت و غم کا نہیں زہرہ کہ جو داخل ہو وہاں
ساعت و سال کا جھگڑا نہیں رکھتا و دیار
آسماں سے کہیں دور اور زمینِ گور کے پار
وہ واں ہے وہ واں ہے میرے پیارے بچے

قلق میرٹھی

بیانِ جنّت

اس زمیں کا کیا جو تم نے بیاں
کہ اہالی ہیں واں کے خوش گذراں
وہ چمکتے ہوئے کنارے جو
نظر آتے ہیں کیا وہیں ہیں وہ
نہیں کر سکتے کیا ہم اس کی تلاش
نہ رہے تا غم اور رہیں بشاش
کیا وہیں لہلہا رہے ہیں مگر
کیا وہیں رقص میں ہیں اے مادر
گل نارنگ تازہ و سیراب
سبز شاخوں پہ کرمک شب تاب
وہاں نہیں وہاں نہیں ہے اے فرزند
کیا وہیں ہے وہ سرزمیں اے ماں
ہے جہاں ریشہ دار نخلستاں

آفتاب اس پہ جب چمکتا ہے
خرما گرمی سے اس کی پکتا ہے

یا ہے واقع وہ خطۂ انور
درمیان جزیرۂ اخضر

دم جنبش کرے ہے جس کی نسیم
دامن دشت پُر زعطر و شمیم

خوشنما وہ پرند نور افشاں
ہو تجلی پروں سے جن کی عیاں

وہاں نہیں وہاں نہیں ہے اے فرزند

کیا کہیں ہے کوئی قدیم جہاں
اور بہت دور ہے یہاں سے جہاں

ریگ زرّینہ پر ہیں بحر رواں
لعل و الماس کان میں تاباں

موتی پہلوے ساحل مرجاں
کیا وہیں ہے وہ سرزمیں اے ماں

ہاں نہیں وہاں نہیں ہے فرزند

جہاں کے وہ جلوہ ہاے روح افزا
جہاں کے وہ نغمہاے عشرت زا

نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھے
نہ کبھی کان نے کسی کے سُنے

یہاں کے عالم میں دیکھنا ہے محال
وہاں کا عالم بچشم خواب وخیال

نہ تو وہاں موت کا نہ غم کا گذر
نہ زمانے کے انقلاب کا ڈر

چرخ سے ہے پرے وہ عرصہ پاک
اور بروں از حدود خطہ پاک

بس وہاں ہے وہاں ہے اے فرزند

ہمترجمہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۱، اور اس حصہ میں صفحہ ۲۵ پر دیکھئے۔

محمد مصطفٰے حسین

مزارِ غریباں

منادی ہو رہی ہے نیرِ تاباں کی رحلت کی
مویشی چپکے چپکے چل دیئے رمنوں سے منہ موڑے
تھکا ماندا چلا جاتا ہے گھر بیچارہ دہقان بھی
کنارہ کر کے دنیا سے اندھیرے میں مجھے چھوڑے

عروسِ شام کا رنگین آنچل بھی ہوا میلا
کھچے قرطاسِ عالم پر سکوتِ موت کے نقشے
فضا میں بھنبھناتا پھر رہا ہے پر کوئی بھونرا
کہیں بجتے ہیں گھنگرو اونگھنے والے مویشی کے

وہ سبزہ پوش بینارہ پہ بوم تارک الدنیا
کسی کے دخل بیجا کا ہے گلہ ہے چاند سے ثاکی
قدامت سے زمانے نے اُسے بے ریب و شک مانا
مجرد بادشاہِ کشورِ خاموش تنہائی

ذرا اُن سامنے والے درختوں کی طرف دیکھیں
نظر آتے ہیں جن کی چھاؤں میں مٹی کے کچھ تودے

ہمیشہ کے لئے افسوس تنگ و تار قبروں میں
پڑے سوتے ہیں اُمّی باپ دادا قریہ والوں کے

نسیمِ صبح یا اٹھکیلیاں بادِ بہاری کی
جگا سکتا نہیں کوئی انھیں ان خوابگاہوں سے

نہ آتشداں ہیں روشن اب کسی کے واسطے گھر میں
نہ بی بی کے لئے باقی رہے اب شام کے دھندے

کہاں بچوں کی وہ خوشیاں جو تتلاتے ہوئے دوڑیں
کہ ڈالیں باپ کی گردن میں ننھے ہاتھ کے پھندے

بہت فصلیں ہوئیں زیر و زبر ان کی درانتی سے
چلے ہل ان کے دائم کھیت کے سنگین بیلوں پر

بڑے گنجان جنگل میں ہوئے اونچے تبر ان کے
جھکے ضربات سے جن کی درختِ سربلند اکثر

ہنسیں اہلِ ہوس ان کے نہ ان پُرامن کاموں پر
گھر بلو ان کی خوشیاں تھیں مقدر ان کے تھے بیٹے
چڑھائیں ناک بھوں ان کے نہ ادنیٰ کارناموں پر
پرستارِ حکومت بادۂ غفلت کے متوالے

مشیخت جاہ و ثروت کی، بھرم عہدِ حکومت کا
تکبر حُسن کا سرمستیاں عشق و جوانی کی
لگا ہے سب کو کھٹکا نہ ٹلنے والی ساعت کا
ہے قبرستان منزل شاہراہِ کامرانی کی

نہ مغرور و دہر والزام تم ان بے زبانوں پر
نہ پاؤ قبر پر گر پر تکلف یادگارانِ کی
نظر ڈالو ذرا اُن معبدوں کی تم کمانوں پر
کہ جن کو دیکھ کر آتی ہے یاد اب بار بار اِنکی

بنا کر اِن کے اسٹیچو رکھیں قبروں پہ کیا حاصل
یہ ان رسموں سے اٹھ سکتے نہیں اپنے مزاروں سے
کتابے ہوں کہ تاریخیں لکھی ہوں سب ہیں لاحاصل
اثر کچھ ان پہ اب ہوتا نہیں ان یادگاروں سے

بہت ممکن ہے اس اجڑے نگر میں سو رہے ہوں گے
وہ اہلِ ذوق حاصل تھا تلمذ جن کو رحمانی
وہ جو مضراب سے سازوں کے فتنوں کو جگاتے تھے
وہ جن کی ذات میں مضمر تھے اوصافِ جہاں بانی

جہاں کے مخمصوں سے پاتے یہ فرصت اگر دم بھر
خزانے علم و فن کے دیکھ لیتے اپنی آنکھوں سے
نہ گرتی برق گر افلاس کی ان کی طبیعت پر
تو پھر اس کی روانی کا یہ دھارا بھی دکھا دیتے

بہت لعل و جواہر ماہِ ریزے نورِ کامل کے
پڑے ہیں جھلملاتے بحر کے تاریک غاروں میں
بہت سے پھول صحراؤں کی خلوت میں کھلے ہونگے
ہوئی برباد جن کی بو جہاں کے ریگزاروں میں

تعجب کیا یہاں ان سونے والوں میں پڑا ہو گا
کوئی ٹیپو لڑا جو گانوں کے افراد سرکش سے
کوئی غالب ملا جس کو نہ موقع شعر گوئی کا
کوئی رستم نہ نکلا تیر باہر جس کی ترکش سے

نہ تقریروں سے اپنی سننے والوں ہی کو تڑپایا
نہ کھٹکے خار بن کر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں
حکومت کا نہ اپنی فیض ہی دنیا کو پہنچایا
کہ چڑھتے ہوشیاری سے رعیت کی نگاہوں میں

انھیں اس طرح قسمت نے سراپا خیر ہی رکھا
بچایا ان کو شر سے اور بار ذمہ داری سے
نہ شوقِ ملک گیری میں بہایا خون انسان کا
نہ رکھا باز مجرم کو در امیدواری سے

نہ دہشت سے حکومت کی صداقت کا گلا گھونٹا
بجھایا نورِ ایمان کو نہ بادِ بے حیائی سے
نہ پیشہ شعر گوئی کا بنا زینہ ترقی کا
ہوئے رسوا نہ خود ہی بے محل مدحت سرائی سے

بچے جذباتِ انسانی کے شیطانی تلاطم سے
ہوئے باہر نہ حد سے اور کیا دامن نہ آلودہ
روش ان کی رہی سایہ میں نفس مطمئنہ کے
سدا یکساں سبکسارانہ و خاموش و آسودہ

تم ان ٹوٹے مزاروں کو حقارت سے نہ ٹھکرانا
یہ آنے جانے والوں کو پتہ عزبت کا دیتے ہیں
کتابے لوحِ تربت کے بایں وضع قدیمانہ
اک آہِ سرد کے بدلے سبق عبرت کا دیتے ہیں

کسی کم علم شاعر کے کتابے گو یہ ہیں لکھے
سبق آموز بھی ہیں مرثیہ کے کام کے بھی ہیں
بتاتے ہیں نشان و نام بھی ان مرنے والوں کے
اشارہ کرنے والے آخری انجام کے بھی ہیں

کرے انسان اپنی جان کو نذرِ فراموشی
لگا دے مہر خاموشی بھی اپنی زندگانی پر
کہیں ممکن ہے وہ مر جائے اور پھر وقت آخر بھی
نہ ڈالے اک نگاہِ واپسیں دنیائے فانی پر

بشر از بسکہ پروردہ ہے آغوشِ محبت کا
یہ خواہش ہے کسی ہمدرد کے سینہ پہ دم نکلے
زبانِ حال ان قبروں کی ہے خود شاہد و گویا
ہماری خاک میں پنہاں شرارے ہیں محبت کے

تجھے بھی لکھنے والے ایک دن مٹی میں ملنا ہے
تری حالت بھی کوئی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا
تو اب جس طرح حال ان مرنیوالوں کا سنا تا ہے
کوئی ہم جنس تیرا بھی کسی سے حال پوچھے گا

کہے گا اس سے پیر سال خوردہ کوئی بستی کا
اسے دیکھا ہے ہم نے بارہا ان رہگزاروں میں
ہمیشہ شبنمستان کا کیا کرتا تھا نظارہ
طلوع مہر سے پہلے وہ اونچے سبزہ زاروں میں

یہ اس پیپل کے نیچے دوپہر کو لیٹ جاتا تھا
اک اندازِ تغافل صاف ہوتا جس سے تھا ظاہر
طرب انگیز نغمہ پاس کے پرشور دریا کا
سنا کرتا وہیں سے اور سو جاتا وہیں اکثر

کبھی طفلانہ خود سرکشیں کرتے ہوئے پھرنا
نظر آنا کبھی چہرہ پہ کیفیات ہذیانی
تبسم نفرت آمیز اس کے ہونٹوں پر کبھی پیدا
ہویدا اس کے بشرے کبھی صدمات روحانی

یکایک ایک دن میری نظر سے ہوگیا اوجھل
پہاڑی پر نظر آیا نہ اونچے سبزہ زاروں میں
نہ دیکھا دوسرے دن جب طبیعت ہوگئی بیکل
لبِ دریا اُسے پایا نہ دیکھا رہگزاروں میں

کُھلا پر تیسرے دن راز کچھ رُوپوش ہونے کا
جنازہ اس کا جاتے جب سوئے مدفن نظر آیا
ادھر آؤ پڑھو پڑھنا اگر کچھ تم کو ہے آتا
یہ خود رو گھاس میں اِس سنگ تربت پر ہے کیا لکھا

کتابہ

اس آغوشِ لحد میں اک جوان آرام کرتا ہے
جو تھا دنیا میں بالکل دولت و شہرت سے بیگانہ
رکھا محروم جس کو علم کی دولت سے قسمت نے
جسے رنج و الم ہی سے سدا رہتا تھا یارانہ

کرم تھا اس کا فطری پر مقدر سے تہید ستی
مصیبت دیکھنا اوروں کی اور ناچار رو دینا
اسے تھی جستجو دنیا میں ہر دم یار صادق کی
بنا خود حق تعالےٰ دوست اس اخلاص والے

نہ اب اوصاف کی اس کے زیادہ چھان بین اچھی
نہ تم کمزوریاں ظاہر کرو اس کی جو بیکس ہے
یہاں ہے قہر کی دہشت بھی اور امید رحمت بھی
جوارِ رحمتِ حق میں جگہ مل جائے تو بس ہے

ہمترجمے حصہ اول صفحات ۷، ۲۳، ۳۲ اور ۴۱ پر دیکھئے۔

مظفرالدین خاں صاحب

ہزار آنکھ ہیں روشن عروسِ شب کیلئے

ہزار آنکھ ہیں روشن عروسِ شب کے لئے
ملا ہے مہرِ درخشاں ہی روزِ روشن کو
تمام رونقِ گیتی بھی ہوگئی رخصت
بس اک زوالِ شہنشاہِ خوش جمال کے ساتھ

ملی ہے چشمِ بصیرت ہی ایک دل کے لئے
دماغ کو ہیں تخیل کی مد ہزار آنکھیں
اسی طرح ہے اندھیرا حیات میں اپنی
جہاں پہ شعلۂ عشقِ نگار سرد ہوا

ہمارا ترجمہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۵ پر دیکھئے۔

دھرم سروپ

حبشی غُلام کا خواب

کھیت میں گر کے پڑا سوتا ہے وہ حبشی غُلام
ہار کر جسم شکن جاں ستاں محنت سے
ہاتھ میں دستہ درانتی کا ابھی ہے اس کے
پاس رکھا ہے نئی کاٹی ہوئی فصل کا ڈھیر
خاک آلودہ ہے بے چارے کا ننگا سینہ
بال اُلجھے ہوئے بکھرے ہیں زمیں پر اُس کے
لیکن اس وقت تو وہ اپنی زبوں حالت سے
بے خبر ہو کے فضاؤں میں وطن کی اپنے
نیند کے دوش پہ ہے ناز سے سرگرم خرام

(۲)

خواب کے پردے پہ اُٹھتی ہے جو یادوں کی چمک
جانے پہچانے مناظر اُسے آتے ہیں نظر

دائمی عظمت سے وہاں بہتا ہے
زور ہے اس کی روانی میں، تموج میں ہے تاب
"پام" کے جھنڈ ہیں میدان میں ہر سو پھیلے
پرسکوں سایہ زریں میں برابر جن کے
لے رہا ہے وہ پھر سیر و تماشا کا لطف
پھر وہ اس ملک کا ہے فرمانروائے واحد
اس کے انداز میں ہے شان و رعونت شاہی
کارواں کوہ سے آتا ہے اترتا کوئی
ساتھ لپٹے لئے آواز جرس کے جھونکے
دمبدم کان میں گھلتا ہی چلا جاتا ہے
میٹھا رس بھولے ہوئے نغمہ آزادی کا

(۳)

سرنگیں آنکھوں میں اپنی لئے الفت کا پیام
ملکہ اس کی کھڑی سامنے ہے پھر اس کے
ایک ہلکا سا تبسم ہے لبوں پر بکھرا
گرد ماں کے ہیں کھڑے بچے بھی اس کے سارے
پا کے پھر بچھڑے ہوئے باپ کو، لو وہ دوڑے
پاگلوں کی طرح جاتے ہیں وہ اس سے لپٹے
ہاتھ سب کرتے ہیں گردن میں حمائل اس کی

اور پھر چومتے جاتے ہیں لگا تار اُسے
ہاتھ میں ڈال کے اب ہاتھ لئے جاتے ہیں
مسکراتی ہوئی کچھ دُور کھڑی ماں کی طرف
یہ خوشی اس سے سنبھالی ہی نہیں جاتی اب
آنکھ سے اس کی ٹپک پڑتی ہے آنسو بن کر
جذب کر پاتے نہیں جن کو مگر پیار کے لب
خاک میں سوئی ہوئی حسرتیں مل جاتی ہیں
اور سویا ہی پڑا رہتا ہے درماندہ قدم

(۴)

پردۂ خواب پہ منظر نیا ہوتا ہے عیاں
اپنے گھوڑے کو وہ دوڑائے لئے جاتا ہے
باگ ریشم کی ہے اور اس کی طلائی ہے لگام
اور خود پہنے ہے فولاد کا زرہ بکتر
اس کی رفتار میں تیزی ہے بلا کی تندی
"نائیجر" بہتا نہیں اڑتا چلا جاتا ہے
پیدا ہوتی ہے صدا ضرب کی ہر جست کے ساتھ
اور اٹھ اٹھ کے بڑے جوش سے ہر بار زیام
برق رو گھوڑے کے پہلو میں لگاتی ہے ضرب
جیسے کہتی ہو اُسے "اور بھی ہاں اور بھی تیز"

(۵)

سر پہ لہراتے ہوئے پرچمِ خونیں کی طرح
سُرخ ڈھینگوں کا اک جھنڈ اُڑا جاتا ہے
رہنمائی کے لئے اس کی ہو جیسے مامور
اُن کے پیچھے رہا دن بھر وہ رواں متواتر
گزرا میدانوں سے، جنگل تھے جہاں املی کے
دور اس کو جھلک اک آئی سمندر کی نظر
صبح سے شام ہوئی شام سے پھر رات ہوئی
اور یہ خواب کا منظر بھی ہوا خواب میں غرق

(۶)

سوتی صورت کا مگر جاگا یہ پھر سے سپنا
شیر کی اٹھی گرج رات کے سناٹے میں
چرخ کی چیخ سے جنگل کی خموشی ٹوٹی
اسپ دریا جو کنارے پہ چلا ندی کے
جھاڑیاں نے کی گئیں ٹوٹتی پاؤں کے تلے
اتری کانوں میں تو اس کے یہ مہیب آوازیں
لیک سپنے نے انھیں بخشا سہانا آہنگ
اس کو ایسے لگا نقادے ہوں جیسے بجتے
فتح و نصرت کے بصد ولولہ و جوش و خروش

(۷)

ہر صدا دشت کی اک نعرہ تھی آزادی کا
جانور، شاخ و شجر، بادِ رواں اور پرند
یک زباں ہو کے سبھی کہتے تھے آزاد ہیں ہم
اور صحرا کے بگولوں نے بھی کر رکھا تھا
جا بجا معرکہ و شورِ قیامت کا بپا
وحشیوں کی طرح وہ چیخ رہے تھے ہر سو
نیند میں چونک اٹھا آنکھ گئی اس کی کھل
دیکھ کر لیک اس ہنگامۂ آزادی کو
پا کے ہر قالبِ فطرت کو خوشی میں سرشار
مسکرا دیا اور خواب میں پھر ڈوب گیا
مسکرا دیا اور سو گیا پھر گہری نیند
جاگتا سلسلہ تھا محنت و مزدوری کا
خواب مزدوری و محنت سے تھی اک راہِ فرار
چوٹ چابک کی تھی گھوڑے پہ جو تھی ضربِ تمام
سرخ لمّ ڈھینگ تھے خود اس کے ہی خوں کے قطرے
دشت و صحرا کی صدائیں تھیں خود اس کلاہِ کرب
ان مصائب کو ملا روپ نیا سپنے میں
بیوی بچوں کی محبت ہی وطن تھا اس کا

مل گئی خواب میں پھر کھوئی ہوئی یہ جنت
اب نہ سپنا تھا مگر اور نہ بیداری تھی

(۸)

نیند یہ نیند تھی ابدی اُسے اب کوئی بھی
جاگنے کا نہ کسی خواب کا احساس رہا
ضرب چابک کی پڑی جسم پہ بھی تو اس کو
کچھ پتہ ہی نہ چلا اور وہ سویا ہی رہا
آگ سورج سے برستی تھی مگر وہ تو وہیں
خاک ہی پہ بڑے آرام سے لیٹا ہی رہا
جسمِ بے جان کے پاؤں میں ابھی تھی زنجیر
روح پرواز مگر کر گئی ہو کر آزاد
موت کے ہاتھوں نے خود نور بقا اس کو دیا
زیست کی ظلمتیں سب ہو گئیں یکسر روشن
بندِ ہستی کے لئے رنج و غم و درد و الم
اب تو مکتی ہی کے احساس کی ہے موج نشاط
مژدہ ہونٹوں پہ ہے جس موج کا اک عکس لطیف

ہم ترجمہ حصّہ اول صفحہ ۵ ۷ اور حصّہ دوم صفحہ ۸۳ پر دیکھئے۔

منورؔ لکھنوی

تماشا گاہِ دنیا

تیرے سینے میں نہاں گر قلب حق آگاہ ہے
دیکھ اے انساں کہ دنیا اک تماشا گاہ ہے
مرد و زن جتنے تجھے دنیا میں آتے ہیں نظر
اصل میں سب اس تماشا گاہ کے ہیں ایکٹر
اپنا اپنا پارٹ اس میں کھیلنے آتے ہیں سب
اپنا اپنا ایکٹ دکھلا کر چلے جاتے ہیں سب
ایکٹ اس کے عمر انسانی کے حصے سات ہیں
سات پردوں سے یہ محو انکشافِ ذات ہیں
شیر خواری کا زمانہ اس کا پہلا ایکٹ ہے
دلفریبی میں یگانہ اس کا پہلا ایکٹ ہے
سایہ میں ماں باپ کے نازوں سے پلنا دیکھئے
گود میں دایہ کی وہ رونا مچلنا دیکھئے

بے خبر دنیا سے لیٹا ہے بچھونوں پر کبھی
گھٹنیوں چل کر لپکتا ہے کھلونوں پہ کبھی

کھیلنا ہمراہ ہم عمروں کے وہ مستانہ وار
ناپنا حدِ زمیں گھر بھر کر دن میں بار بار

الغرض جب پارٹ کر چکتا ہے یوں اپنا ادا
پھر نظر کے سامنے ہوتا ہے منظر دوسرا

ایکٹ ہے اس سین میں علم و ہنر کا اکتساب
اس سمندر کے لئے اُس کا سفینہ ہے کتاب

نام سُن کر مدرسے کا ڈال کر تیوری پہ بل
بادلِ ناخواستہ جاتا ہے بستہ در بغل

بھولی بھولی شکل پر قربان ہے نورِ سحر
جانبِ مکتب قدم اُٹھتا ہے رک رک کر مگر

صبح دم ہوتا ہے تازہ دم مگر مجہول ہے
اک قیامت کی جگہ اس کے لئے سکول ہے

کسبِ علم و فن سے ہو جاتا ہے جب حاصل فروغ
تیرے منظر سے ہوتی ہے طبیعت باغ باغ

نوجوانی کی رنگین رات دن ہیں زور پر
آتش سے اب کچھ کم نہیں سوزِ جگر

ہے زباں پر ذکرِ دلبر قصۂ ہجر و وصال
دور ہوتا ہی نہیں محبوب کا دل سے خیال

شاید مقصد کے ارمانوں سے دل بے تاب ہے
جوش میں اُلفت کے اک کیفیتِ سیماب ہے
ذکر اس کو ابروئے دلدار کا نشتر ہے ایک
پار ہو جاتا ہے جو سینے کے وہ خنجر ہے ایک
روپ چوتھے ایکٹ میں جرار کا بھرتا ہے پھر
معجزے خنجر گزاری کے عیاں کرتا ہے پھر
ہے گرجتا رزمگہ میں جا کے شیروں کی طرح
داد جانبازوں کی دیتا ہے دلبروں کی طرح
ہے سلاحِ جنگ سے آرائشِ تن کی ہوس
بیٹھنے گھر میں نہیں دیتی کبھی ان کی ہوس
رزم کے میداں میں ہے مائلِ پیکارو جنگ
جوشِ ہمت میں نہیں کچھ خدشہ تیر و تفنگ
توپ کے بھی سامنے ہے خواہش نام آوری
فوج اعدا کے مقابل میں ہے محوِ صف دری
پانچویں پردہ کی بھی کیا دیدنی ہے سینری
ہو رہی ہے اب عیاں شان عدالت گستری
واہ کیا شان تمول یہ ہے کیا جاہ و حشم
فضل حق سے ہر طرح کی شان و شوکت ہے بہم
بیٹھنا کس رعب سے ہے مسند انصاف پر
اس کے توش و تن کی جانب بھی ذرا ہو اک نظر

فربہی الوانِ نعمت سے شکم پر آشکار
ہے یہ گویا ایک مرغانِ مسلّم کا مزار

فیصلوں میں خوبی فہم و فراست آئینہ
دیدۂ روشن سے ہے حلم و مروت آئینہ

پھر چھٹے پردہ کا ان آنکھوں سے منظر دیکھئے
وہ خمیدہ سی کمر وہ جسم لاغر دیکھئے

ناک پر عینک معین دیدۂ کمزور ہے
یہ سفر اس کا وہ ہے اب جس کی منزل گور ہے

اب تو ہے پسماندۂ عہد جوانی پر بسر
موزۂ محفوظ کی جانب ہی رہتی ہے نظر

اب کہاں وہ لہجہ مردانگی آواز میں
پھر وہی باتیں ہیں تھیں جو عمر کے آغاز میں

کس قدر غالب نقاہت آگئی آواز پر
راگ جاری ہیں نفس کے ہڈیوں کے ساز پر

بعد ازاں جو آخری منظر ہے عبرت ناک ہے
دامنِ ہستی بشر کا جس کے آگے چاک ہے

دوسرا بچپن یہی ہے عالمِ نسیاں بھی
ختم ہو جاتی ہے جس پر داستانِ زندگی

دانت غائب آنکھ غائب اور بے مصرف زبان
پھر آتا نہیں یہ اجتماعِ جسم و جاں

ضمیمہ حصہ دوم صفحہ ۱۳۵ زیر نظم

قیصر

باپ بیٹوں کو وصیّت کرتا ہے

میرے بیٹو اب میں اس دنیا سے ہوں منہ موڑتا — اور ترکہ میں ہوں کیا کیا چیزیں دیکھو چھوڑتا
گو تمہارے واسطے ہوں چھوڑتا سامان میں — لیکن اپنے جی میں لے جاؤں گا یہ ارمان میں
یہ تمہارے پاس سے ہو جائے گا جلدی فنا — یہ تو تم بھی ہو سمجھتے پاس ہے کس کے رہا
چھوڑ جاتا ہوں نصیحت میں تمہارے واسطے — زندگی جس سے بسر ہو وہ بتاؤں مشورے
تم گرہ میں باندھ رکھو اور حفاظت سے رکھو — کام تم جو کچھ رکھو اپنا نصیحت سے رکھو
مشورہ وہ چیز ہے جس کو ہمیشہ ہے بقا — دوست اور ماں باپ اور اسباب سب کو ہے فنا
ہاتھ سے اپنے نہ جائے رکھو عزت کا خیال — خرچ کرنے میں رہے ہر دم کفایت کا خیال
نیکی اور مردانگی دنیا میں تم حاصل کرو — اچھی نیت اپنے ہر اک کام میں شامل کرو
جس سے تم نیکی کرو بدلہ نہ چاہو اس سے تم — جس کی تم محنت کرو عوض نہ مانگو اس سے تم
گرتیموں اور بیواؤں کا دیکھو حالِ بد — تم سے ممکن ہو جہاں تک، ان کو پہنچاؤ مدد
تم رکھو ہر وقت مذہب کی حفاظت کا خیال — چاہئے ہر وقت تم کو ملک و ملّت کا خیال
ملک پر گر جان بھی قربان کر دو تو ہے کم — سب سے پہلے دستگیری پر اٹھانا تم قدم
اپنے حق مانگو حکومت سے رکھو اس کا خیال — ورنہ ہو جائیں گے غفلت سے تمہاری پائمال

کام کو پہلے سمجھ لو، پھر دلیری سے کرو — حق پہ تم زندہ رہو اور جب مرو حق پر مرو
شادی کرنے کے لئے بی بی کرو گر انتخاب — یاد رکھو اچھی بی بی سے رہو گے کامیاب
خاکسار اور پارسا عورت کو تم ترجیح دو — ایسی عورت پر، جو حسنِ ظاہری میں فرد ہو
خوشنما ہوتے ہیں صورت میں کنول کے پھول گو — لیکن ان میں کچھ نہیں بو باس صورت دیکھ لو
اچھی اچھی صورتیں ہو جاتی ہیں جلدی خراب — تم اُس بی بی کا کرنا چاہئے بس انتخاب
جو کہ اچھی طرح رہتی ہو سمجھ رکھتی ہو خوب — وہ نہ ہو، جو لاتے دولت اور ہوں اسمیں عیوب
وہ ہے ایسا شہد کڑواہٹ بہت رکھتا ہے جو — اپنے امکاں میں جو بچ سکتے ہو تم اس سے بچو
ایسے ہی کرتے رہو تم دوستوں کا انتخاب — معتمد اپنا بنانے سے کرو تم اجتناب
یہ ہے ممکن اک رکھے شیریں زباں مکّار دل — اور اُس سے ہو تمہارا خود بخود بیزار دل
میرے بیٹو تم مصیبت کا رکھو ہر دم خیال — تا کہ آجائے نہ اس سے زندگی میں کچھ ملال
سب سے پہلے انتخاب اپنی ضرورت میں کرو — دوستوں کی آزمائش تم حقیقت میں کرو
ہوں تمہارے دوست گر تم سے زیادہ مالدار — دوستی کا تم کرو ان کی نہ ہرگز اعتبار
چیونٹیوں سے گرمیوں میں جمع کرنا سیکھ لو — شہد کی مکھی اکٹھا کر رہی ہے شہد کو
گھر بنانا سیکھو گرمی میں ابابیلوں سے تم — آ کے جب مشکل پڑے تم عقل کو کرنا نہ گم
پوری ہو جائے ضرورت اور کفایت سے رہو — اور غربت میں نہ تم اپنی حماقت سے رہو
تم گنہ سے تو بچو ہر چیز میں ہو مالدار — مالداری میں مگر اپنا نہ کھونا اعتبار
چھوڑ دو گے تم اگر دنیا اگر مر جاؤ گے — بعد مرنے کے بڑی عزت میں خود کو پاؤ گے
ہو گی دنیا میں تمہاری شان و عظمت آشکارا — ہو گی دنیا میں تمہاری قدر و عزت آشکارا

فتح سے منسوب ہو جاتی ہے بالآخر شکست
شک نہیں اس میں کہ دُنیا ہے بڑی مُردہ پرست

---

* ترجمہ حصہ اول صفحہ ۷۰ اپر دیکھئے۔

سعید الدین خاں سعیدؔ

بے لوث محبت

(۱)

محبت مجھ سے میرے حسن کی خاطر ہے گر جاناں
نہ کرنا بھول کر مجھ سے محبت میں ترے قرباں
محبت اُسی سے کر عالم میں ہے جو نیّرِ رخشاں
شہِ خاور، مظفر طُرفہ عظیم الشاں
محبت ہے جوانی سے مری گر شاہدِ نازاں (۲)
نہ کر حاشا محبت مجھ سے میرے دلبرِ ہجراں
محبت فصلِ گل کر جو ہے یکسر بہارستاں
لیئے آتی ہے ہر سال اک نیا افسوں نیا فیضاں

(۳)

محبت ہے خزانوں سے مرے گر تجھ کو مہرِ جاں
نہ کر مجھ سے محبت تو، نہیں ہے یہ ترے شایاں
محبت بحر سے کر جو ہے گہرا اور بے پایاں
جواہر سے بھرا رہتا ہے جس کا نیلگوں داماں
محبت گر محبت ہی کی خاطر ہے تو جانِ جاں
محبت عمر ساری شوق سے کرنا اسی عنواں
تجھے دوں گی دل اپنا معتبر، صادق نکو بنیاں
بہار و مہر و قلزم سے جواں، شاداں، چہاں رخشاں

ہم ترجمہ حصہ دوم صفحہ ۱۳۲ پر دیکھیے۔

منیر کاکوروی

نسترن

عجب بیری خوشبو گل نسترن ہے
جگر دوز کیف آور و جاں شکن ہے

تر و تازگی میں ہے تو شوخ و رعنا
بناوٹ میں تیری عجب بانکپن ہے

ہر اک برگ گل اک مرقع طلسمی
خوبان عالم کی تو انجمن ہے

ورق تیرے گویا فسانے ہیں دلکش
دل و دیدہ نصیب اور ساوتری محو حسن ہے

تماشائے جذبات عالی ہیں تجھ میں
کہ سیتا کی آس اور ہراس دمن ہے

شکنتلا کی تجھ میں خوشبو ہے پنہاں
سرشک غم آلودہ پر فتن ہے

احمد شاہ بخاری پطرس

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا   الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا   اور دہلی گیا
واں جو پہنچا
تو دیکھا:۔
کہ اس جا کے لڑکے   ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے   ہیں ویسے لمبے
اور اس جا کی برفی   ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی   ہے ویسی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں   ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس   ہیں بیس (۲۰) اور بیس (۲۰)
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا   اور تکتا رہا
اور تکتا رہا   اور حیراں ہوا

دھرم سروپ

آغازِ موسم کے گُلِ بنفشہ سے خطاب

ہوا کیا جو ہے خاکِ یخ تیرا بستر
اگر تیری پوشش ہیں ٹھنڈی ہوائیں
ہوا کیا جو ہے تیرا سنگی نہ ساتھی
اگر سر پہ چھائی ہیں کالی گھٹائیں
نہیں غم اگر تیرا طالب نہیں ہے
اگر تیری بکھری ہے خوشبو
نہیں غم جو ہے خوب پر زشت حاوی
نہیں غم جو غالب ہیں نیکوں پہ بدخو
گلِ تر بدل اپنی خصلت نہ ہرگز
تو اپنے پرانے چلن پر جئے جا
تو مست اور پاکیزہ خوشبو سے ہر دم
فضاؤں کو ہر سو معطر کئے جا

شمیم کرہانی

صبح کا گیت

صبح کے دھندلکے میں طائروں کی پروازیں
آرہی ہیں مل جل کر زندگی کی آوازیں

میرے لال! ظلمت میں صبح نو کی آہٹ ہے
بے خبر! یہ آنسو بھی ایک مسکراہٹ ہے

ہیں سحر کے ہونٹوں پر روشنی کے افسانے
تیری عقل کیا سمجھے، تیری آنکھ کیا جانے

منہ اندھیرے چڑیوں نے مست گیت گائے کیوں
ندیوں کی موجوں کے تار جھن جھنائے کیوں

دن کی بھیڑ کیوں آئی رات کیوں اکیلی ہے
کیسے تجھ کو بتلاؤں زندگی پہیلی ہے

ایسی اک پہیلی جو حرف و لفظ سے پہلے
کہتی تھی اشاروں میں کس طرح سے جی بہلے

اس لئے بہر صورت روپ بن کے آتی ہے
چھاؤں بن کے آتی تھی دھوپ بن کے آتی ہے

زندگی تو پلتی ہے موت ہی کے ہاتھوں میں
کھوتا ہے آنکھ اپنی دن اندھیری راتوں میں

ہیں سحر کے ہونٹوں پر روشنی کے افسانے
تیری عقل کیا سمجھے، تیری آنکھ کیا جانے

ضامن کنتوری

جوانی اور پیری

نظم تھی سرگرم سیر اُن پھولوں میں مثل صبا
جن کا رس لیتی ہے ب امید دلربا رو
اور تھا جاری حکم امید و نظم دونوں پر مرا
عمر آزادی کے ساتھ اس وقت ہوتی تھی بسر
ہر جگہ تھی فطرت و امید میری ہم سفر
تھی امیدِ نظم میری شاہد رنگیں ادا
ہے مگر یہ ذکر جب کا میں جواں تھا جب کبھی
وہ زمانہ یاد گر آتی ہے اس کی اب کبھی
دیکھ کر فرق اب میں جب روح ہوتی ہے خفا
گھر ہوا دار اپنا یہ جس گھر کا ہے معمار اور
یعنی یہ قالب جو ہے اب موجبِ آزار اور
جس سے راحت کی جگہ ایذا پہنچتی ہے سدا

باغ وصحرا میں رفیق اپنا تھا یہ ہادی کی طرح
اُڑتا پھرتا تھا ہوا میں کاغذِ بادی کی طرح

روح جیسی تھی سبک ویسا ہی ہلکا جسم تھا
حال کی حیرت فضا جیسے دخانی کشتیاں
جن میں ہے مجداف کی حاجت نہ دخلِ بادباں

خوف ہے جن کو طلاطم کا نہ کچھ بیم ہوا
یونہی اس قالب کو بھی موسم کی تھی پروا نہ کچھ
خوف آندھی کا نہ تھا اور بیم طوفاں تھا نہ کچھ

پر یہ کب؟ رہتے تھے جب ہم اور جوانی ایک جا
گل میں ہے معشوقیت اور عشق میں گل کی بہار
دوستی کہتے ہیں جس کو وہ نخل سایہ دار

ایک دلچسپ ایک دلکش اور ہے اک خوشنما
ہائے وہ خوشیاں کہ جوان سب سے حاصل تھیں مجھے
دوستی عشق اور آزادی کو ملتے تھے مزے

حاکم پیری کا جب تک دور دورہ یہ نہ تھا
ہائے اے پیری ہے تیری کیسی ہیبت ناک شکل
اب نہ آئے گی جوانی کی نظر وہ پاک شکل

وہ جوانی دل میں گھر کرتی تھی جس کی ہر ادا

اے جوانی کر دیا کیوں ترک تو نے میرا ساتھ
جانتے ہیں سب اسے تھا جیسا میرا تیرا ساتھ
دل پہ ہے اس بے وفائی سے تری صدمہ بڑا

چھوڑ دے گی تو مجھے ہرگز نہ تھا اس کا یقیں
تیرا یوں جانا سمجھ میں کچھ میرے آتا نہیں
قافلہ تیرا گیا کب اور جرس کس دم بجا

ہاں مگر بہروپ بھرنا خوب آتا تھا تجھے
اب ہے تو کس بھیس میں للّٰہ سچ بتلا مجھے
تیرے جانے یا نہ جانے کا مجھے کچھ تو پتا

گو ہے حیرت دیکھ کر ان نقرئی بالوں کی شان
قامتِ خم گشتہ بھی بے حد ہوا ہے ناتواں
اپنی صورت کو بہت پاتا ہوں میں بدلا ہوا

رنگ سے ہر گل کے پیدا ہے مگر تیری جھلک
ذرّہ سے خورشید تک میں ہے عیاں تیری چمک
عالمِ امکاں کی گویا تجھ پر اب تک ہے بنا

اس لئے مجبور ہوں کرنے پر اس کے میں یقیں
میں جدا تجھ سے نہیں اور تو جدا مجھ سے نہیں
مثلِ سابق دونوں کی ہے اک جگہ نشو و نما

دامنِ صبحِ وطن میں جو ہے بن جاتی گہر
شامِ غربت میں وہی شبنم ہے اشکِ چشمِ تر
تابشِ غم ہے طراوت ساری کر دیتی ہوا
یونہی باقی جب نہیں رہتی ہے دل میں کچھ امید
اور بڑھاپا آ کے کرتا ہے خوشی کو ناپدید
جس طرح مفلس عزیزوں کو کرے کوئی جدا
جن کی فرقت کا تصور کر کے دل ہوتا ہو شق
تاب مہمانی نہ ہو اور رہو جلاتی کا قلق
اے جوانی یونہی تجھ سے بھی جدا ہونا پڑا

منور لکھنوی

غنچوں سے خطاب

اے چمن کے غنچہ ہائے نو بہار
اے وقار افزائے نخلِ سایہ دار
حالت ابتر ہے چمن کی کس قدر
ہے یہ مرجھانے میں جلدی کس قدر
کوئی آفت چرخ نے ڈھائی نہ تھی
کچھ ابھی فصلِ خزاں آئی نہ تھی
کھل کے پھر جلوہ دکھاؤ تو ذرا
چپکے چپکے مسکراؤ تو ذرا
کچھ گلستاں میں دکھاؤ تو بہار
بلبلوں کو بھی تو ہونے دو نثار
کیوں کہ آخر تو چلے ہی جاؤ گے
دردِ فرقت سے مجھے تڑپاؤ گے
عالمِ ہستی میں تم پیدا ہوئے
کیا گھڑی بھر کی مسرت کے لئے

دو گھڑی کی تھی یہ صحبت آہ آہ
اور اتنی جلدی رخصت آہ آہ

تم کو قدرت کیا ریاضِ خلد سے
صرف لائی تھی نمائش کے لئے

اور تم کو چھوڑ کر تنہا یہاں
کر گئی خوں گشتۂ فصلِ خزاں

میرے پیارے غنچہ ہائے نوبہار
رونقِ گلزار کے سرمایہ دار

ہم کو دیتا ہے سبق یہ بوستاں
کیسے ہو جاتے ہو تم نذرِ خزاں

ہم کو ملتا ہے یہاں سے یہ پتا
کس طرح آتا ہے پیغامِ فنا

کیسے سب چیزیں دکھا کر اپنی شاں
بس تمہاری ہی طرح سے ایک آں

چھوڑ کر چکے سے باغ پر بہار
خاک میں ملتی ہیں پھر انجامِ کار

نیستی کا یوں پتہ دیتی ہیں وہ
قبر اپنی جگمگا دیتی ہیں وہ

* [illegible] مجلہ عثمانیہ [illegible] ۱۳۵ [illegible]

شہاب سرمدی

ابر

چشمہ اور دریا سے جا کر پانی میں بھر لاتا ہوں
پیار سے پھولوں کو لا لا کر آبِ حیات پلاتا ہوں
چڑھتی دھوپ میں جب پتوں کی رنگت مرجھا جاتی ہے
بادل کا نمگیرہ لا کر ان کے سر پہ لگاتا ہوں
صبح کے وقت جو طائر اپنے گھونسلوں میں سو جاتے ہیں
جھاڑ کے اپنے پیر کی شبنم چھینٹا دے کے جگاتا ہوں
جاتا ہوں خرمن کو ب فلاخن اولوں کی لے کر کھیتوں پر
غلہ دانی کی محنت سے دہقانوں کو بچاتا ہوں
میں وہ سخی ہوں دست کرم ہے میرا ہر اک شے پہ دراز
اولوں سے بحر و بر میں یکساں در نجف برساتا ہوں
آن کی آن میں پانی کر کے ان کو بہا دیتا ہوں پھر
بجلی اور گرج سے ہنستا گاتا پھر گھر جاتا ہوں

چیخنے لگتے ہیں اشجار تناور اس کے صدمہ سے
کوہ کی چوٹی سے جو سلیں ہیں برف کی نیچے گراتا ہوں

بادِ طوفانی ہی کی گود میں مجھ کو چین کچھ آتا ہے
اوجلے تکیے رکھ کے سرہانے رات کو جب سو جاتا ہوں

برق تپاں، رہبر ہے جو میری، شب بھر پہرہ دیتی ہے
دم بدم اپنے قیدی رعد کو شور مچاتے پاتا ہوں

بجلی راہنمائی میری کرتی ہے دشت و دریا میں
افسانہ جناب کا اس کو میں جس وقت سناتا ہوں

اس کو یقیں ہوتا ہے اپنے محبوبوں کے ملنے کا
کوہ و دشت و دریا کو جو میں ان کا ٹھکانا بتاتا ہوں

صبح کو آتا ہے خسروِ خاور سر پر رکھے تاج زری
اپنی کشتی میں اس کو اٹھا کر سیر کو میں لے جاتا ہوں

جیسے پہاڑ کی چوٹی پر سیمرغ نشیمن کرتا ہے
ویسے ہی اس مرغ زریں کو میں بھی سر پہ بٹھاتا ہوں

لیکن شام فلک پر جب ہے کھلاتی تختہ لالے کا
میں بھی اس کے عشق میں غوطہ بحرِ خوں میں لگاتا ہوں

تختِ زبرجد پر یہ لیلیٰ ہوتی ہے جس دم جلوہ نما
روک کے تختِ باد پئے تعظیم کھڑا رہ جاتا ہوں

نور کی چادر اوڑھے ایک کتابی چہرے والی حور
بیٹھ کے محمل میں شب کے آتے ہی جب میں جاتا ہوں

خدا کے کام

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا
پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوش نما اگائے
پہنا کے سبز خلعت اُن کو جواں بنایا
خوش رنگ اور خوش بو گل پھول ہیں کھلائے
اس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا
سورج بنا کے تو نے رونق جہاں کو بخشی
رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکاں بنایا
سورج سے ہم نے پائی گرمی بھی روشنی بھی
کیا خوب چشمہ تو نے اے مہرباں بنایا

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا

تنکے اٹھا اٹھا کر لائیں کہاں کہاں سے
کس خوب صورتی سے یہ آشیاں بنایا

اونچی اڑیں ہوا میں بچوں کو پر نہ بھولیں
ان بے پروں کا ان کو روزی رساں بنایا

کیا دودھ دینے والی گائے بنائی تو نے
چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عنان بنایا

رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں میسّر
ان نعمتوں کا ہم کو کیا قدرداں بنایا

پیاسی زمیں کے منہ میں تو نے چوایا پانی
اور بادلوں کو تو نے مینہہ کا نشاں بنایا

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے
چکھنے سے جن کے ہم کو شیریں دہاں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاریگری ٹپکتی
یہ کارخانہ تو نے کب رائیگاں بنایا

شہاب سرمدی

تصور

وہ چہرے چھپ گئے آنکھوں سے جو بل کھا کے گاتے ہیں
مگر ان نرم آوازوں کے نغمے یاد آتے ہیں

خزاں نے نیلگوں پھولوں پہ اک زردی جمائی ہے
مشام روح میں لیکن ان کی سمائی ہے

چمن پژمردہ ہے ہر سمت بے کیفی کا ساماں ہے
مگر برگِ گلِ خوش رنگ تزئین شبستاں ہے

مجھے بھی جب شب ہجراں کی تنہائی ستاتی ہے
تصور ہے ترا جس کے سہارے نیند آتی ہے

آج اور کل

(۱)

تقدیر اگر ہو مسکراتی
رستے میں پھول ہو بچھاتی
چننے ہوں وہ پھول تو یہ سننا
بس آج ہی پھول تم وہ چننا

(۲)

ہمّت پہ اگر نہ کچھ بڑھی ہو
قسمت کی تیوری چڑھی ہو
گر رنج ہو اس کا اے برادر
کل پر رکھنا یہ رنج کل پر

(۳)

آج اپنی خطا ہیں مانتے گر
کل ظلم جو کر رہے تھے ہم پر
کافی ہے ندامت ان کو کافی
دینا انھیں آج ہی معافی

(۴)

پر غم ہے جو صبح و شام تم کو
لینا ہے اگر انتقام تم کو
دینی ہے سزا حریف کو گر
رکھنا موقوف اس کو کل پر

(۵)

قرضہ دینا ہے گر کسی کا
وعدہ کل کا ہے اس سے ٹھہرا
کل کا نہ زباں سے لفظ کہنا
آج اس کو ادا ہی کر کے رہنا

(۶)

ہو قرض کسی پہ گر تمہارا
بازی قسمت کی ہو وہ ہارا
کل کا کرے آج گر بہانا
بات اس کی کل میں آزمانا

(۷)

توبہ کرنی ہو گر بدی سے
شیطاں ہر چند دانت پیسے
کچھ بیت و لعل نہ اس میں کرنا
ہاں آج ہی توبہ کر گزرنا

(٨)

ترغیب بدی کی دے کوئی گر
دل شوقِ گناہ میں ہو مضطر
کل تک ٹھہرو یہ دل سے کہنا
قائم اسی کل پہ روز رہنا

نتیجہ

سنتے ہو عزیز نکتہ پرورا
ہر کام کا وقت ہے مقرر
کیوں آج کے کام میں خلل ہو
کل کا جو کام ہے وہ کل ہو

وحید الدین سلیم

آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں

وہ دیکھ کہ موجیں رقص کناں ہیں سطحِ زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریا حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی اٹکھیلیاں کرتی ڈھال اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں متوالی ہے رفتار اس کی

اتر کی طرف جب اٹھتی ہے اس قافلہ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلّۂ کوہِ ہمالہ پر عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
دیووں کو ہیں تانے دیو کھڑے ابر سے سروں کو ملائے ہوئے

برگد کے درختوں کے جنگل پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جوان کی سایہ فگن ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ فیلِ مست یہاں ہے کا جنکے قد پہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

ہے رنگ برنگ کے پھول کھلے زینت ہے چمن کی شبنم انکا
کھولا ہے نسیم سحر نے بھی کس شان سے بندِ نقاب ان کا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو خیبر کے دروں سے اتر کے ابھی
دیکھے تھے انھوں نے لالہ و گل یا میر کی وادی ہیں نہ کبھی

طائر بھی یہاں پیدا ہیں کیئے قدرت نے عجب گل رنگ حسیں
گر زمزمے ان کے رسیلے سن لیں یاد آئے انھیں فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریاں گاتی ہیں جو دلکش راگنیاں
یہ لوچ سروں میں ان کے نہیں یہ سوز گلوں میں انکے کہاں

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں نور و حرارت سے باغوں کو اور ان کی فضاؤں کو
سوتی ہوئی سوتیں چشموں کی اٹھتی ہیں سب آنکھیں مل مل کر
دھاریں ہیں جو برف کے پانی کی آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

اے لوریو آؤ قدم رکھو ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے سدا اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن ہر کر کے ہوں ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

لفظ ناکامی زباں پر بھی نہ لاؤ تم کبھی

ہاں بڑھو آگے ہمیشہ چھوڑ دو کم ہمتی
بیدل و مایوس ہو رہنے سے بہتر ہے یہی
ذمِ ہمت میں بلاشک فتح پاتے ہیں وہی
ہاتھ سے دیتے نہیں جو باگ استقلال کی
لفظ ناکامی زباں پر بھی نہیں لاتے کبھی

ہے تمہارے پاس چشمِ دور بین سیفِ زباں
اور مونس ہے دلِ جرّار ہر دم بے گماں
تو اگر ان سے مدد، دشمن پکاریں الاماں
الغرض وہ جو بہادر زور آور ہیں یہاں
لفظ ناکامی زباں پر بھی نہیں لاتے کبھی

اس لئے آگے بڑھے جاؤ نکالو اپنی راہ
خوف ہے کیا گر مقابل ہے مخالف کی سپاہ

اسلحہ سے ہیں جو دانش کے مسلّح اہلِ جاہ
صاف ہے میدان اُن کو صورتِ پیکِ نگاہ
لفظ ناکامی زباں پر بھی نہیں لاتے کبھی
شدتِ طوفان یا آتش فشاں ہو آفتاب
زندگانی کی گلابی صبح میں تم اے جناب
رہنما اپنا بنا لو آپ، ہے عہدِ شباب
کارزارِ دہر میں موٹو بنا لو یہ شتاب
لفظِ ناکامی زباں پر ہم نہ لائیں گے کبھی

ضامن کنتوری

نسیم سحر

خوش گوار اک نسیم کا جھونکا
کر گیا آ کے روح کو تازہ

سنسناہٹ تھی اس کی پر معنی
صادر احکام ہوتے تھے قطعی

گہ اشارہ تھا اشک شبنم سے
دور ہو گل کے عارضِ نم سے

کہیں تھا انتظام دریا کا
کہیں تھا بندوبست صحرا کا

واں جہازوں کے لنگر اٹھتے تھے
مرغ ادھر جھاڑ کر پر اٹھتے تھے

تھی منادی یہ شاخساروں میں
عَلَم سبز آ گے آ گے رہیں

حکم مرغانِ خوشنوا کو یہ تھا
کہ ہوئی صبح پھر ہوں حمد سرا

کاشتکاروں کو مژدہ جا کے دیا
کہ اٹھو کھیت بو دو دن نکلا

تھا درختانِ بارور کو یہ حکم دو
کہ ہو جو رسنگ صمٌ بکمٌ

جا کے گھڑیال گھر میں حکم دیا
کہ بجا کر جرس یہ کر دو ندا

آ گئی صبح ہوشیار ہو پھر
غافلو صرفِ کاروبار ہو پھر

کر کے یوں ہر طرف سے اطمیناں
آئی پھر سوئے شہرِ خاموشاں

نفس سرد اک بھرا ناگاہ
بے ثباتی پہ یاں کی تھا جو گواہ

بولی کس نیند آج سوئے تم
سب اٹھے آہ پر نہ اٹھے تم

منوّر لکھنوی

فاتح اجل

اے فاتحانِ عالم ہرگز نہ اب جتانا
ہے شاندار کتنی وہ مملکت تمہاری
ہرگز نہ رزمگہ میں کوسِ ظفر بجانا
ہے اب کہاں وہ شاہی وہ سلطنت تمہاری

اب زیبِ سر کہاں ہے اکلیلِ زرفشانی
اٹھ کر دکھاؤ ہم کو پھر شانِ تاجداری
ہنگامِ رزم ابھی کیا ہے شوقِ کامرانی
باقی ہے دل میں کوئی ارمانِ تاجداری

مالک ہوئے جہاں میں ساتوں سمندروں کے
ساحل پہ ساحل اپنا تم نے قدم جمایا
حالانکہ ملک چھینے دو چار خود سروں کے
جنگاہ میں ہزاروں کو خاک میں سلایا

لیکن کہاں ہے اب وہ جاہ وجلال نفرت
دیکھو نظر اٹھا کے وہ تخت و تاج اپنا
آخر میں کیا یہی تھا ملنا مآل نصرت
اٹھو وصول کر لو سب سے خراج اپنا

تھا اپنی سلطنت پر بے جا غرور تم کو
فرعون سے نہیں کچھ تم خود سری میں کم ہو
مل جائے نتیجہ اس کا ضرور تم کو
اب وقت آگیا ہے فرق نیاز خم ہو

ہوگی طلب تمہاری جب شہر خامشی میں
پروانہ اجل پر سر خود جھکاؤ گے تم
تھا جس قدر اٹھایا سر اپنی زندگی میں
ہاں ہاں ضرور اس کا پھل آج پاؤ گے تم

جنگ وجدل کی آفت قحط و وبا کے نرغے
ان سب کے ہاتھ میں ہے انساں موت تیری
درپیش ہوں گے تجھ کو لاکھوں بلا کے نرغے
لیکن میں کر رہی ہوں آسان موت تیری

پھرتے ہیں بھیس بدلے قاعدرے جہاں میں
تو ان کی صورتوں کو پہچان بھی نہ پایا
تیری قضا ہے پنہاں تیرے ہی جسم و جاں میں
اسرار نیستی کے تو جاں بھی نہ پایا

امراض و قحط یوں تو ہیں موت کے بہانے
لیکن یہی نہیں ہیں اسباب نیستی کے
جو اختیار بخشا ہے موت کو خدا نے
برباد کر رہا ہے وہ کھیل زندگی کے

اک موجۂ تبسم تجھ کو فنا کرے گا
پیش نگاہ ہوگا نظارہ نیستی کا
اک بوسۂ شکر زا پیغام مرگ دے گا
دل آ کے توڑ دے گا چپکے سے آدمی کا

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

نصیحت یہ ہے میری رکھنا خیال
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو
اگر کامیابی ہو پہلے محال
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو
تمہاری جو ہمت کا ہووے ظہور
نہ آوے ارادہ میں ہرگز فتور
ڈرو مت انھیں فتح ہوگی ضرور
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو
ہو اک دو دفعہ گرچہ ناکامیاب
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو
بالآخر جو منظور ہے فتح یاب
کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

نہیں شرم اس میں کہ کوشش کریں
اگرچہ نہ بازی کو ہم جیت لیں
بتاؤ تو اس وقت کیا ہم کریں
کیئے جاؤ کوشش میرے دوستو
اگر کام ہو سخت سے سخت تر
کیئے جاؤ کوشش میرے دوستو
زمانہ میں پاؤ گے انعام و زر
کیئے جاؤ کوشش میرے دوستو
کریں دوسرے لوگ جس کام کو
کرو صبر گر، تم سے کیوں کر نہ ہو
نظر نیک اس قاعدہ پر رکھو
کیئے جاؤ کوشش میرے دوستو

محی الدّین

خدا کی صنعت

جو چیز خدا نے ہے بنائی اس میں ظاہر ہے خوشنمائی
کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا
ہر چیز کی ہے ادا نرالی
حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی
ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں چھوٹی چڑیاں چہک رہی ہیں
چڑیوں کے عجیب پر لگائے ہر رنگ کے پھول ہیں کھلائے
کیا اونچے پہاڑ ہیں بنائے میدانوں میں نالے ہیں بہائے
ہو شام کا وقت یا سحر کا
ہے رنگ شفق کا آشکارا

رات

رات ہے وقت راحت و آرام
شام لاتی ہے خواب کا پیغام
حرکت کے ہے بعد عیش و سکوں
نشہ مئے سے بھی ہے لطف فزوں
وہ بچھونے پر لیٹنا تھک کر
کیا ہی دیتا ہے لطف تا بہ سحر
سر کے نیچے وہ گدگدا تکیہ
وہ تھکے ماندے دن کے عضوِ بدن
نرم گدے پہ پھیل کر ہیں مگن

ضامن کنتوری

تمنّا

یہ اک روز پوچھا تمنّا سے میں
لیا تو نے کب اور کیوں کر جنم؟
کہا اس نے "ایام تھے وہ خوشی کے
کہ پیدا ہوئے موسمِ گل میں ہم"

کہا میں نے اے دل رُبا حور پیکر
بتا سچ کہ ہے بطن سے کس کے تو؟
کہا اس نے کہتے ہیں مردم یہ اکثر
تخیل ہے باپ اور ماں جستجو

جو پوچھا وہ ہے کیا نام دایہ کا تیری؟"
تو سن کر لگی کرنے وہ یوں بیاں
"کسی کو نہ ہو جس کی صحبت سے سیری
ہے کہنا جوانی جسے سب جہاں

کہا میں نے "آخر غذا تیری کیا ہے؟"
کہا اس نے "پوچھو نہ کچھ اس کا حال
کبابوں میں جو لخت دل کے مزا ہے
ہے کہنے سے اس کا سمجھنا محال"

جو پوچھو کہ "پیتی ہے تو کون سی مئے
تو بولی عجب ناز سے وہ پری"
"لگاتی نہیں منہ سے میں کوئی شے
بجز عشقِ عشاق کے دوسری"

کہا میں نے "گہوارہ ہوگا وہ کیا"
کہ پائی گئی جس میں طفلی میں تو؟
کہا "تھا وہ ایسی امیدوں کا جھولا
کہ واں تک پہنچتی نہ دہشت کی بو"

کہا میں نے جب کون دیتا تھا لوری
کہ سن کر جسے نیند آتی تجھے؟
کہا باتیں ہمدردوں کی میٹھی میٹھی
سناتی تھیں افسانے دلکش مجھے

جو پوچھا "ٹھکانہ ہے تیرا کہاں پر
مکاں کس جگہ اور منزل ہے کیا؟
تو بولی زمیں پر ہوں نہ آسماں پر
ہے بس اہلِ ہمت کا دل گھر میرا

جو پوچھا کہ صحبت میں رہتی ہے کس کی؟
تو بولی "ہے محبت سے نفرت مجھے"
کہا پھر ہے شغل اور کیا دل لگی کی؟
کہا بس ہے اک کنجِ عزلت مجھے

کہا دوست رکھتی ہے تو اپنا کس کو؟
کہا اس کو جو میرا ہو دردمند"
کہا جانتی ہے عدو اپنا کس کو
کہا آرزو کو ہو جس سے گزند

جو پوچھا کہ "وہ کب ہے تجھے موت آتی ہے"
کہا "وہ بھید اس کا نہ سمجھا کوئی
کرشمے ہیں ایسے ہوں لاکھوں زندگی
ادھر مر گئی اور ادھر جی اٹھی

اختر

میرا ہمسایہ کون ہے

یہ خیال آیا کسی دن میرا ہمسایہ ہے کون
حضرت دل نے کہا فوراً کہ سُن اے بیخبر

تیرا ہمسایہ ہے وہ جس کا کہ دل ہے دردمند
فکر و غم سے جس کو رہنا ہے سدا دوران سر

دست شفقت تیرا پہنچا سکتا ہے تسکین جسے
جس کو کر سکتی ہے خوش تیری عنایت کی نظر

تیرا ہمسایہ ہے وہ جو مفلس و نادار ہے
فرطِ فکر اشتہا سے ہے جسے ضعف بسر

دربدر جس کو پھراتی ہے جہاں میں مفلسی
جا، اگر مقدور رکھتا ہے تو کچھ امداد کر

تیرا ہمسایہ ہے وہ جو ہے تھکا ماندہ بہت
جس کا دورِ زندگانی آگیا ہے ختم پر

ضعف و تکلیف و مرض سے ہے کمر جس کی دوتا
تو مداوا بھی کر اس کا اور دلجوئی بھی کر

تیری ہمسایہ زنِ بیوہ ہے اور طفلِ یتیم
بےکسی روتی ہے جن کے حال پر شام و سحر
نعمتِ دُنیا سے جو محروم ہیں محتاج ہیں
جا، اگر کچھ رحم ہے دل میں تو لے ان کی خبر
تیرا ہمسایہ ہے وہ جو ہے غلامِ زرخرید
جسم کیا جس کا تصور تک ہے قیدی سربسر
جس کی امیدِ رہائی موت پر موقوف ہے
جا، اسے آزاد کر، آزاد کر، آزاد کر
تیرا ہمسایہ وہی ہے جس کی حالت ہے تباہ
زیست اپنی کر رہا ہے جو کہ مر مر کر بسر
اپنے بیٹے اور بھائی کے برابر جان اُسے
جا در مقصود و مطلب سے کر اس کو بہرہ ور
پندِ اخترؔ پر ذرا کر غور یوں غافل نہ بن
تو چھڑا سکتا ہے بندِ غم سے ان سب کو مگر
وہ جو ہاتھوں سے مصیبت کے ہوتے ہیں دلفگار
کچھ تو حصہ اپنی قسمت کا انھیں تقسیم کر

"زمانہ"، کانپور جنوری ۱۹۱۴ء

محمدؐ عباس کاظمی نیشاپوری

پھُول سے گفتگو

کل چمن میں حسین پھُولوں سے
ہو رہی تھی یہ گفتگو مجھ سے

جلد کیوں جا رہے ہو جانِ بہار
تم پہ رنگینیاں چمن کی نثار

عاشقِ زار دل تمھارا ہے
تم میں ہر ایک مجھ کو پیارا ہے

پا کے ہم تم کو پیار کرتے تھے
مُسکراتے کچھ اور دن رہ کے

تم سے قلب حزیں بہلتا تھا
تم سے ارمان دل نکلتا تھا

اس قدر جلد جب کہ جانا تھا
تم کو قدرت نے کیوں کیا پیدا

تھوڑی دیر اپنا حسن دکھلا کے
آہ ہو جاؤ اوجھل آنکھوں سے

پھول نے اس طرح دیا یہ جواب
ہے یہی رسم چرخ خانہ خراب

جب کہ رہنا چمن میں ہے مشکل
حُسن پر میرے کیوں لگائیں دل

پھول کھلتا ہے ایک دن کے لئے
کیوں کسی کے گلے کا ھار بنے

ہے ہمارا یہ حسن بس دم بھر
جس طرح سے ہو شبنم گلِ تر

نہیں اس دہر میں ثبات گل
سبق آموز ہے حیات گل

فضلُ الرحمٰن

موسم بہار

پھر آیا موسم بہار　　وہ موسموں کا تاجدار
ہر ایک شے میں تازگی　　ہر آن بزم رقص تازگی
ہوا میں سردی معتدل　　پرندے شاد و زندہ دل
پپیہوں کی ہے ہوک یہ　　کہ کوئلوں کی کوک یہ
آہا آہا یہ چہچہے　　ادہو ادہو یہ زمزمے
خوشی کا گھر ہر اک مکاں　　ہے گاؤں یا کہ گلستاں
کسان با فراغ سب　　گڈریے باغ باغ سب
مویشی ریل پیل میں　　ہیں جیسے بچے کھیل میں
پپیہوں کی ہے ہوک یہ　　کہ کوئلوں کی کوک یہ
اہا اہا یہ چہچہے　　ادہو ادہو یہ زمزمے
مہک رہے ہیں کو بہ کو　　گلی گلی ہے مشک بو
ادھر ہیں گل بہر قدم　　شباب و حسن ادھر بہم

ڈھلی جوانیوں کا رُوپ   گلابی جاڑوں کی یہ دھوپ
پپیہوں کی ہے ہوک یہ   کہ کوئلوں کی کوک یہ
اہا اہا یہ چہچہے   اوہو اوہو یہ زمزمے
پھر آیا موسم بہار
طرب فزا دم بہار

منصور احمد

پیشین گوئی

ہماری زندگی کے بعد شاید　　　کوئی فصلِ بہار آئے گی ایسی
اٹھے گی اک صدائے بازگشت اور　　　ہمارے گیت اک دُنیا سُنے گی

دوست

اے دوست نگاہ اٹھاؤ　　　آنکھوں میں آنکھیں ڈالو!
اس راہ سے دل میں اترو　　　تن من کو حسین بنا دو!

خوبی

خوب ہے جو حسیں ہوا　　　بُت ہوا نازنین ہوا
جو نہ حسیں ہوا مگر　　　خوب ہوا حسیں ہوا

بندِ عشق

اب مجھ کو گرفتارِ محبت نے کیا ہے　　　سرتا بقدم خوف سے میں کانپ گئی ہوں
تلخی ہے تو شیریں ہے ستم ہے تو محبت　　　اس راحتِ جاں سوز کو میں بھانپ گئی ہوں

اک زمانہ

میں نے بھی اک زمانے میں تم سے الفت کی ہے
ایک زمانے میں بس کہ اب مدت ہی گزری ہے

طوفان

جب عشق کے آثار نظر آتے ہیں
اس طرح یہ جسم و روح گھبراتے ہیں
طوفان میں جس طرح ہوا کے اندر
اشجار ریگستان کے تھراتے ہیں

شام

بچّے ماؤں کی گودوں میں
بھیڑیں اپنے گلوں میں
بکری، بکری والے کے پاس
لال شفق میں پرندوں سا
جو زر سحر نے بکھیری ہے
زریں ماتھے سے جو شے
تو اس پر چھائی ہے اے شام
جادو ہے تیرا کتنا عام

نیند

کالی کالی آنکھوں والی
نیند رات کی بیٹی

وقت

دریا کی اور وقت کی ہے چال ایک سی
بہتے ہیں دونوں ایک ہی رفتار سے سدا
روکے انھیں، کسی کی بھلا کیا مجال ہے
سلطاں کی فوج ہو کہ ہو عبّاد کی دعا
گرتا ہے بحر میں وہ تو ابحرِ ابد میں یہ
حالت میں ان کی فرق نہیں کوئی ظاہرا
لیکن خدا نے چشمِ بصیرت ہے جن کو دی
ہے فرق ایک اُن کی نظر میں بہت بڑا
یعنی کہ بے نتیجہ نہیں آب کی روش
دریا جہاں سے گزرے مقرر ہو فائدہ
شاداب ہوں درخت تو سرسبز مرغزار
کھیتی ہری ہو اور مقامات کے سوا
لیکن جو وقت کو یونہی بیکار چھوڑ دیں
اُلٹا ضرر ہو نفع کہاں فائدہ کجا

اختر جوناگڈھی

خوش و خرم سرزمین

سویپن، سیکسن، و بوہیمیں — مے کدے میں جمع ہوتے اکدن
تھا ہر اک درد و رنج سے آزاد — بیٹھ کر مے کدے میں خرم و شاد
جام پر جام وہ لنڈھانے لگے — سرخوشی کے مزے اُڑانے لگے
مے کدے کے کلال کی دختر — دیتی تھی ان کو جام بھر بھر کر
جب جمے نشے اور سرور بڑھے — آگئے سُرخ آنکھ میں ڈورے
پھر تو بے پر کی وہ اُڑانے لگے — راگ اپنے وطن گانے لگے

جب گئی وہ کلال کی دختر — سویپن لڑکھڑایا یہ کہہ کر
سرزمین سویپن کو خُدا — رکھے آباد تا بروزِ جزا
مرد   ورو سب زنان حسین — ہیں ہمیشہ سویپن میں مکیں
گو ممالک وسیع ہوں کتنے — سب مقابل میں اسکے ہیں ہیٹے

سیکسن خوب ہنس کے یوں بولا — "گیا تری سوچ میں زمیں ہے بھلا
ہے اگر ملک کوئی بھی اچھا — ملک ہے وہ ہمارا سیکسن کا
اس میں رہتی ہیں نازنیں اتنی — انگلیاں ہوویں ہاتھ کی جتنی

غصے میں ہو کر بوہیمین بولا — جانے کیا ہو ملک بوہیمیا
کوئی فردوس ہے اس جا — تو وہ ہے سرزمین بوہیمیا

جب یہ سودائی بڑ ہوئی پوری — اور ہر ایک کہہ چکا اپنی
بیٹھ کر دور دختر کلوار — سن رہی تھی جوان کی یہ گفتار
ان سے کچھ دیر بعد یوں بولی — سوئے گردوں اٹھا کے وہ انگلی
چپ رہو بند کر کے اپنی زباں — دُند یہ کیا مچا رکھا ہے یہاں
سب ہیں جھگڑے یہ واہیات نرے — سرزمیں آسماں کی بڑھ کر ہے
خوش و خرم، اگر زمیں ہے کوئی
تو وہ بس ملک آسماں ہے یہی

شیدا

بلا عنوان

سمجھتا ہوں میں سچ دنیا میں ہر درد و مصیبت کو
موثر پاتا ہوں ہر رنج سے اپنی طبیعت کو
جو سچ پوچھو تو ناکام محبت ان سے بہتر ہیں
نہ پاس آنے دیا مطلق جنھوں نے درد الفت کو

عظمت اللہ خاں

ایک گیت کا ترجمہ

نہ کہئے کہ ننھّا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھّا کہیں کس لئے
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو
تو کیا اس کے ہونے گزرتے کے کارن
اٹھانا پڑا دُکھ کسی کو زیادہ
بڑی یا چھوٹی نظر ہیں خدا کی
سب یکساں ہے خدمت اگر حسب سابق
ہے عرشِ معلےٰ پہ حق جلوہ فرما
ہے اس ذات بیچوں کے انوار سے
زمیں اپنی بر ریز ہر شخص یاں
وہی کر رہا ہے جو ہے حق کی مرضی
یہاں کام کوئی نہ اعلےٰ نہ ادنیٰ!

نذیر حسین احمد انبالوی

ایذائے حیوانات

احباب میں اپنے اسے شامل نہ کرونگا اطوار نجستہ ہوں کہ فہمیدہ ہوں
بے اسکے ضرورت کوئی مجبور کرے جو روندے کسی کیڑے کو جو رہگزر میں
غفلت کا قدم ایک کچل سکتا ہے جھینگر جو وقتِ پگہ رہگزرِ عام رہیں گے
یہ ہوگی شرافت جسے وہ آگہی پا کر
ٹک ہٹ کے چلے گا اُسے مرجانے نہ دیگا

بدر الحسن بدر جلالی

سمندر

اک مسرت لم یزل تنہائیِ ساحل میں ہے
اک سرورِ غیر فانی وشتِ بے منزل میں ہے

کیسی تنہائی جہاں آراستہ وہ بزم ہے
پاک تہدیدِ فنا سے جس کا ہر اک عزم ہے

جس کی زینت بڑھ رہی ہے نغمۂ امواج سے
جس کا ہر قطرہ مزیّن ہے حبابی تاج سے

میری طبعِ شاعرانہ دشمنِ انساں نہیں
ہاں مگر فطرت سے زیادہ عشق کا امکاں نہیں

اضطرابِ حاضرہ سے رشتۂ غم توڑ کر
خامشی سے . . . ماضیہ کو چھوڑ کر

کائناتِ دہر کا نظارہ چیں ہوتا ہوں میں
شوقِ پابوسی میں اب نقشِ زمیں ہوتا ہوں میں

کیا مسرت آفریں ہیں بے تکلف صحبتیں
کس قدر صبر آزما ہیں دلربائی حرکتیں

منظرِ فطرت سے درس بے خودی پاتا ہوں میں
محویت کا دل میں احساس خفی پاتا ہوں میں

چشم حیرت دیکھ لو کیفیتِ روئے زمیں
کہہ نہیں سکتا ہوں میں لیکن چھپا سکتا نہیں

ہاں بحر اے پیکر تاریک بحرِ رنگ ساز
تیرے سینہ پر رواں ہیں سینکڑوں جنگی جہاز

صفحہ بر حضرتِ انسان کی جولانگاہ تھا
تیرا ساحل اس کی قدرت کی مگر تھا انتہا

یہ تیرا میدان آبی ۔ تیری بازی گاہ ہے
سامنے جس کے جہاز کوہ پیکر گاہ ہے

اور جہاں باقی نہیں ہے حرص انسانی کا نقش
جس جگہ بن جاتی تھی اس کی ہوس پانی کا نقش

قطرۂ بارش کی صورت تیری گہرائی میں جب
شکوۂ بیچارگی سے کھولتا ہے اپنے لب

کھول دیتی ہے اجل آغوش موج دل شکن
کس مپرسی دفن کر دیتی ہے بے گور و کفن

فضل الرحمٰن

نایاب شہ دانے

نسرین و سمن چہرہ — خوش رنگ چمن چہرہ
پر نور شجر قامت — فردوس نظر قامت
لب غنچے ہیں جنت کے — تر میوے ہیں جنت کے
بے مول نہ من مانے — نایاب یہ شہ دانے
جب تک نہ اشارے سے — تجھ کو وہ اجازت دے
کلیوں میں لب تر کی — لڑیاں دُر و گوہر کی
یا ہیروں کے ہیں ٹکڑے — دامن میں گلابوں کے
حسرت میں امیر و شہ — ہر دست ہوس کو نہ
بے مول نہ من مانے — نایاب یہ شہ دانے
جب تک نہ اشارے سے — تجھ کو وہ اجازت دے

شوخ آنکھیں نگہباں ہیں　　دو خلد کے رضواں ہیں
پیوستہ کمان ابرو　　کھینچتی ہے ہر آن ابرو
مژگاں کو جو دے جنبش　　بد بینوں پہ ہو یورش
بے مول نہ من مانے　　نایاب یہ شہ دانے
جب تک نہ اشارے سے
تجھ کو وہ اجازت دے

ظفر احمد نظامی

تیری یاد

ڈوبتے ہیں جو نرم رو نغمے
نغمگی ذہن میں مچلتی ہے
پھول پژمردہ ہو رہے ہوں جب
خوشبو احساس بن کے پلتی ہے
حسن کی سیج، بعدِ مرگِ گل
برگِ گل سے سجائی جائیگی
تو نہ ہوگا تو عشق کو تری یاد
اپنی آغوش میں سلائے گی

ارشد صدیقی

خوابوں کا بازار

بھرے بازار میں بکتے اگر خوابوں کے افسانے
تو اے شاعر تو اس بازارِ بے پایاں سے کیا لیتا
کچھ ایسے خواب جن کی نقد پیغامِ اجل ہوتی
کچھ ایسے جو اک آہ نرم و نازک ہی میں مل جاتے
وہ آہ نرم جس سے زیست کے تاجِ درخشاں کا
فقط اک برگ گل جنبش میں اگر ٹوٹ جاتا ہے
بھرے بازار میں بکتے اگر خوابوں کے افسانے
مسرت بخش و غم انگیز سیلابوں کے افسانے
اور ان کا بیچنے والا صلائے عام جب دیتا
تو اے شاعر تو اس بازارِ بے پایاں سے کیا لیتا

میں لیتا عالمِ خاموش میں وہ مسکنِ تنہا
جہاں ہنستے ہوئے پھولوں کی اک رنگین روش ہوتی

وہ جس کے سایۂ دامن میں بے پایاں سکوں ہوتا
جو میرے آخری دم تک مری غمخواریاں کرتی
میں تاجِ زیست کا ہر گوہرِ شہوار دے دیتا
گرا دیتا خوشی سے خود کو میں آغوشِ فطرت میں
خریداری گراں کی ہوتی میرے دستِ قدرت میں
بھرے بازار میں مجھ کو یہی اک خواب راس آتا
کہ اس سے دل کا ہر رِستا ہوا ناسور بھر جاتا

شفیق احمد

اس کی ادا

وہ دیکھنے میں حسین بھی نظر نہ آتی تھی
دکھائی دیتی ہیں اکثر گنواریاں جیسی
میں جانتا ہی نہ تھا اس کی دلکشی کو کبھی
مجھے وہ دیکھ کے جب تک نہ مسکراتی تھی
پھر اس کی آنکھ میں میں نے جھلک سی اک دیکھی
وہ جس سے پھوٹ رہی تھی ضیا محبت کی

نگاہیں اس کی ہیں اب سرد اور شرمیلی
مری نظر کا اب ان میں نہیں جواب کوئی
میں اب بھی دیکھ رہا ہوں نگاہوں میں اسکی
وہی لگاؤ محبت کی روشنی اب بھی
حسین ہزار سہی مسکراہٹ اوروں کی
زیادہ ان سے حسین تر ہیں خفگیاں اس کی

سعید الدین خاں سعید

بھکارن

سراپا نور، سرمستے، بہارِ جاں گل اندامے
زباں قاصر تھی جس کے حسن و خوبی کو بیاں کرنے
ادا سے سینہ پر ہاتھوں کو باندھے اس بھکارن نے
کیا جب برہنہ پا جلوہ، آگے شاہِ بہمن کے
پہن کر تاج و خلعت شہ اتر آیا جبھی نیچے
کہ تسلیم و استقبال کا اس کو شرف بخشے
رئیسوں نے جو دیکھا اس پری پیکر کو تو بولے
فزوں تر ہے جمال اس کا بلا شک روزِ روشن سے
چمکتا چاند ہے جیسے ابر آلود آسمانوں میں
نظر آئی وہ رشکِ حور معمولی سے کپڑوں میں

کسی نے مدح کی آنکھوں کی اور پائے نگاریں کی
کسی نے زلفِ برہم کی، کسی نے روئے نسریں کی
پری رو حاملِ حسنِ ملائک تھی سر تا سر
نہ تھا جس کا زمانے میں کوئی بھی ثانی و ہمسر
قسم کھائی شہ بہمن نے باعزّ و جلال و شاں
بھکارن اب بنے گی بیگم شاہنشہ ایراں

فضل الرحمٰن

سیلیا سے خطاب

آنکھوں سے پلا جامِ شراب
کر دے مخمور نگاہوں سے شتاب
شب کو ہنگامِ مدائے بادہ
بوسہ دے جام کو جائے بادہ
اور بڑھا دے اسے میری جانب
پھر نہ ہوں گا کبھی مئے کا طالب
تشنہ لب تشنہ دہاں ہوں کب سے
دیکھ میں تشنہ بہ جاں ہوں کب سے
تیرے ان ہونٹوں کا ساغر جو ملے
نہ لوں پھر بادہ کوثر جو ملے
تحفہ بھیجا تھا تجھے میں نے جو ہار
میرا مطلب یہ تھا اے جانِ بہار

تیری مانند رہیں تازہ گلاب
حسن روز افزوں ہو روز افزوں شباب

ارمغاں کر دیا تو نے واپس
بھر کے ہر پھول میں خوشبوئے نفس

اب ہر اک غنچے میں نکہت ہے تری
رنگ گل کی جگہ رنگت ہے تری

تلوک میرٹھی

میرا باپ کشتی بان ہے

بحر مواج ہولناک میں تھی
ایک کشتی بھی چلی جاتی
جملہ کشتی نشین تھے سرتاپا
غرق دریائے خوف ہوش رُبا
لیک تھا ایک طفل کشتی باں
عین طوفاں میں بالب خنداں
ترش ابروئے موج جو دیکھی
آئی بے ساختہ کچھ اس ہنسی
تب لگا کہنے اس سے اک ملّاح
یہ تو وقت اور یہ خوف اور یہ مزاج
طفل بولا میں کیوں ڈروں ناداں
جب کہ ہے باپ میرا کشتی باں

پچ ہے جب ڈوبنے لگے بیڑا
ہے سہارا خدا کے لنگر کا

مشکلیں سخت جو کرے آساں
اور دُعا کو سُنے ہے جو ہر آں

دے ہے ہر رنج کے عوض راحت
گریۂ غم میں خندۂ عشرت

متوجہ ہو اس کی جانب جو
غرق دریائے رنج و غم کیوں ہو

یاد لڑکے کی ہے مثل ہر آں
کہ ہے ہم سب کا باپ کشتی باں

شمیم کرہانی

آزادی کی صبح

ذرا دیکھو ماں پیڑوں پہ چڑیاں
خوشی کے گیت کیسے گا رہی ہیں
بتاؤ کب تک آئے گا وہ دن ماں!
کہ میں گاؤں گا آزادی کے نغمے
مرے بیٹے نہ ہو مایوس ہرگز
ندی جیسے پہاڑوں سے اتر کر
سمندر کی طرف چلتی ہے سرمست
ممکھی شہد کی جیسے دم شام
پلٹتی ہے تو چھتے ہی کی جانب
بہت تیزی سے بڑھتا جارہا ہے
اسے روکے بھلا کس میں ہے طاقت
اسے ٹوکے بھلا کس میں ہے جرأت

مرے بیٹے یقین کر ایک دن تو
اسی چڑیا کی صورت ہوگا آزاد
قفس کی تیلیاں ٹوٹیں گی ایک دن تو
فضائیں قید سے چھوٹیں گی اک دن
نئی منزل کی خاطر میرے جانباز
کسی تازہ سفر کا ہوگا آغاز

ارشد صدیقی

تاتاری

اگر میں شہنشاہ تاتار ہوتا
نہ ہوتا کوئی دوسرا میرا ثانی
مسہری مری ہاتھی دانتوں کی بنتی
مرا تخت سونے کی چادر کا ہوتا
محل میں مرے لاکھوں طاؤس پھرتے
میرے دشت میں سیر تفریح کرتے
اچھلتی ہوئی تال کی مچھلیوں کے
چمکدار پر دھوپ میں جھلملاتے

اگر میں شہنشاہ تاتار ہوتا
تو شاہی مغنّی ترانوں کی لے میں
مجھے میرے کھانے پہ ہر دن بلاتے
محل میں مرے روز شہنائی بجتی

شراب اور شہد اس قدر لال پیلے
سرِ شام ہی قہقہے جگمگاتے
رباب اور گیتار و نے روز مجھ کو
خوش آواز بیٹھے ترانے سناتے

اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا
میں پوشش پہنتا نئے موتیوں کی
سنہرے سفید اور ہرے موتیوں کی
گھنے اور باریک سے موتیوں کی
سحر کا ستارہ نہ جب جھلملاتا
پہن کر میں پوشاک تلوار کستا!
سواری مری کھینچتے سات گھوڑے
اندھیرے تاتار کے راستوں سے
میں کہلاتا تاتاری میوؤں کا مالک
میں شاداب و شفاف چشموں کا مالک
میں تاتار کے کوہساروں کا مالک
گھنے جنگلوں سبزہ زاروں کا مالک
چمکتے ستاروں مہکتی ہواؤں
سمندر کے مانند چمکیلی جھیلوں

پرندوں کو خوش کرنے والے درختوں
غرض ساری چیزوں کا مختار ہوتا
اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا

+ + +

محی الدین

ایک دوسرے سے پیار کرو

ایک دوسرے سے کیا تم کرتے ہو پیار بچّو؟
اور سچے دل سے ہر دم اوروں پہ مہرباں ہو
کیا ساتھ دوسروں کے کرتے ہو کوئی نیکی؟
نیکی کی تاکہ ان سے تم بھی امید رکھو
ایک دوسرے سے ہو تم نرمی سے پیش آتے؟
بے فائدہ کسی کا دل تو نہیں دکھاتے؟
ہاتھوں سے یا زباں سے پہنچے نہ دکھ کسی کو
اس بات کا بھی دل میں تم ہو خیال لاتے
اک دوسرے سے بچو! الفت سے پیش آؤ
بھولے سے بھی کسی کا ہرگز نہ دل دکھاؤ
بھائی اگر تمہارا ناراض تم سے ہو جائے
پھر بھی جواب میں تم ماتھے پہ بل نہ لاؤ

آنند نرائن ملاؔ

بلّی اور چوہا

یہ بلّی نے چوہے سے اک دن کہا
بہت تو نے مجھ کو پریشاں کیا
ارادہ ہے دعویٰ کروں تجھ پہ آج
نہیں ہے مجھے اور کچھ کام کاج
یہ ڈرتے ہوئے موش نے یہ عرض کی
نہیں یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی
کوئی اس میں دھوکا ہوا ہے ضرور
کہیں مجھ میں اتنی سکت ہے حضور
میں اور ایسی گستاخیاں کیا مجال
بدل ڈالئے آپ اپنا خیال
بھلا فیصلہ کی یہاں کون راہ
نہ جج ہی کوئی ہے نہ کوئی گواہ

کہا اس سے بلّی نے چُپ بدتمیز!
نہ کر رائیگاں میرا وقتِ عزیز

کوئی اس میں تاخیر ممکن نہیں
یہ جھگڑا چلے گا ابھی اور یہیں

میں جج ہوں، میں جوری، میں ہی مُدّعی
سزا تجھ کو دیتی ہوں میں موت کی

قلق میرٹھی

حکایت ولیم ٹیل

کان رکھو سنو ادھر آؤ
ٹیل کے پیش آیا واقعہ جو

نہر روڈس کے روز ساحل پر
چھوٹا گلہ وہ اپنا لے جاکر

تگ و پو سخت و رنج دور اندیش
بہر روزی وہ رکھتا تھا دل ریش

فن نخچیر میں تھا لاثانی
درمیان علاقۂ یوری

کب کسی کی پہنے بُز کوہی
تھی نظر تیز راست رو ایسی

اس کے گھر ایک چھوٹا لڑکا تھا
خند رو بھورے بالوں والا تھا

اس قدر خوش دل و قوی بازو
کہ خوشی کی جُدا نہ دل سے کبھو

باپ کی بھیڑیں اس کی دوست تمام
بھیڑوں کو وہ بلاتا لے کر نام

بچے بھیڑوں کے کھیت میں جبدم
کھیلتے یہ بھی کھیلتا باھم

باپ بیٹے خوشی میں تھے ہردم
پاس آنے نہ دیتے دل پر غم

لُطف ہر روز کا اٹھاتے تھے
طالب خوش دلی تھے فردا کے

ہوتے دیکھا ہے لیکن اکثر بار
صبح کو اُڑدی کو دم میں نبیرہ و تارہ

دیکھتے دیکھتے بروز خوشی
دل میں چھا جاتی ہے گھٹا غم کی

ابھی اس ملک میں کشود نہ تھی
صبح آزادی کی نمود نہ تھی

کہ یکایک اک آکے حاکم اور
ان پہ کرنے لگا تعدی و جور

ساعتِ بد میں آسٹریا سے
آیا بھیجا ہوا وہ یہاں کے لئے

یہاں جب آیا وہ وحشی مغرور
نخوت و کبر کے نشے میں چور
ایک حاکمی کے زعم میں آ
بڑھی ٹوپی بلند سر پہ لگا
حکم جاری کیا کہ سجدہ کرو
اور عدول مکابرہ سے ڈرو
جو غلام اس میں عذر لائے گا
وہی بے شبہ مارا جائے گا
اتفاقاً اسی صباح فتور
ولیم نے اپنے گھر سے ظہور
چھوٹے لڑکے کا وہ پکڑ کر ہاتھ
سوئے الٹارف آیا لے کر ساتھ
کیوں کہ وہ طفل نامور اکثر
اپنے گھر دیکھتا تھا صید پدر
سُن کے صیادوں کی بہم گفتار
تھا تمنائی تلاش شکار
بارہا جب شب نشاط افزا
سر یا صید کا بیاں ہونا
ہونا شائق شکاری بننے کا
اور گمان پدر اٹھا لیتا

مرتع شوموا کے سمت آئے
لڑکے نے راگ لڑکوں کے گائے
ادھر پدر بہم ناک و پُر زخطر
اہل یوری کے رنج و نقصاں پر
دیکھا اک مجمع اور کلاہ بلند
اور چین جبین ظلم پسند
دی منادی نے یہ ندا پرسو
کرو سجدہ غلامو دیر نہ ہو
گیزلر منتظر کہ دہقانی
رکھے سجدے میں اپنی پیشانی
ٹیل تھا پر خمیدگی سے جُدا
سر سے بھی سوا سہی بالا
اور یہ سنجیدگی سے اس نے کہا
میری گردن جھکے گی پیش خدا
جان ہے گرچہ بادشاہ کے ہاتھ
پر عقیدہ مرا ہے میرے ساتھ
سن کے یہ بات اس کی غصے ہو
بولا حاکم نقیبوں سے پکڑو
یہ حکومت کا منہ چڑاتا ہے
ہم کو یہ سرکشی دکھاتا ہے

کی ہنسی اور مقابلہ میرا
چاہئے اس کو باغیوں کی سزا
ٹھہر جاؤ یہ گل چلا ہے بڑا
اور زمانہ میں اس کا ہے شہرا
بھورے بالوں کا نوجواں لڑکا
لاؤ یہاں آزمائیں فن اس کا
تھا وہاں ایک درخت لیموں پاس
باندھا لڑکے کو اس سے بے وسواس
اس کے سر پہ انھوں نے سیب رکھا
اس نے حیرت سے ہر طرف کو تکا
ٹیل نے کی پکار کر یہ صدا
ہے اگر کچھ تو ہے گنہ میرا
انتقام اپنا مجھ سے تم لے لو
پر بچاؤ بچاؤ لڑکے کو
ہائے یہ طفل خوب و تازہ جواں
کیوں کہ پہنچاؤں اس کو میں نقصاں
طنز سے گیزلر نے اس سے کہا
خون اس کا اگر زمیں پہ گرا
تیری ہوگی ضرور خوں ریزی
تو ہی خوں ریز اس کا ہے یعنی

جلد اب تم کمان کو اپنی چڑھاؤ
سیدھے سیدھا تیر اپنا اٹھاؤ
اور جانو کہ سامنے کا سیب
اڑ گیا تو رہائی ہے لاریب
لوگ تھے سارے مبتلائے بلا
تھی بلند اک صدائے واویلا
مرد سب کوستے تھے جھلا کر
عورتیں رو رہی تھیں چلا کر
ٹیل ثابت قدم پچاس قدم
دور لڑکے سے تھا کھڑا پُرغم
چشم پرخشم ہونٹھ بند کئے
تھا کھڑا مستقل کماں کو لئے
خم کیا پشت کو مثل کمان
تو بھی تھی اس پہ راستی قربان
واقعی یہ زمین معمورہ!
حسرت و رنج و غم سے پُر ہے سدا
بدوں عصیاں سے آج تک ایسا
سوگ زا واقعہ نہیں دیکھا
تھا کھڑا کودک شریف و دلیر
رنگ رُوپ خوف سے نہ تھا تغیر

اور پکارا کہ تیر مار وہاں
شست حکمی میں کیا خطا کا گماں

باپ بولا کہ بارک اللہ پسر
تیری ہمت سے ہوں خجل یکسر

کھینچی کھرتا بگوش اپنی کماں
اور رفتار تیر پر تھا دھیاں

لوگ چلائے تیر جب چھوٹا
اڑ گیا سیب بچ گیا لڑکا

گو بشر کا بشر برا چاہے
وہی ہوتا ہے جو خدا چاہے

کیوں کہ واقع میں تیر خوب و صحیح
ایسا اس کی چلا کماں سے صریح

گویا پہنچا دیا فرشتے نے
جو گرا ہو کے سیب دو ٹکڑے

جب دلیرانہ ہو چکا یہ کام
بولا حاکم کروں کا وعدہ تمام

اور بولا کہ اپنے گھر کو جاؤ
دونوں تم باپ بیٹے گلہ چراؤ

سرد مہری سے بولا دہقاں یوں
شکر نعمت کا کیا تمہارا ہی کروں

ہے سزاوار حمد و شکرِ خُدا
میں کروں گا اسی کا شکر ادا

تو بھی مغرور جاں تیری اجل
پاس تھی گر نشانہ جاتا ٹل

بے گنہ گر یہ لڑکا مرجاتا
جب ہی وقت سفر تیرا آتا

کیوں کہ تھا تیر دوسرا دیکھو
پہنچتا کچھ جو زخم لڑکے کو

خیراب تم کرو ثنائے خُدا
کہ مرا پہلا تیر راست چلا

حق کی اللہ نے اعانت کی
اور گنہ سے مری حفاظت کی

وہ تکبر سرشتو کو کیا کیا
کرتا ہے نادم و خجل ہر جا

حامی ہے وہی عاجزوں کا اگر
ہوں مقابل جو ان کے طاقت ور

حمد اس کی بزرگ نام کو ہے
حمد اس کی سترگ نام کو ہے

فضلُ الرحمٰن

روزلین

جیسے حسین فضاؤں میں   لہریں اٹھیں ہواؤں میں
چرخ کی جیسے ہو منیا   رنگ سنہری زلفوں کا
ماہ جبیں وہ روزلین
نیلمی آنکھوں کا فسوں   جیسے فلک ہو نیلگوں
کیا کہوں ان اداؤں کو   رشک ہے دیوتاؤں کو
کاش وہ ہو مرے لئے
عارض سُرخ یا شفق   جس سے سحر کا رنگ فق
یا ہے نقاب سیم و زر   چہرۂ آفتاب پر
ماہ جبیں وہ روزلین
غنچہ و گل لب و دہن   سانسوں میں نکہت چمن
چھین لے جو جہاں کا دل   محفل آسماں کا دل
کاش ہو وہ مرے لئے

کیا ہے وہ گردن حسیں   سیمیں منارہ گر نہیں
عشق جہاں پہ قید ہے   تیر نظر کا صید ہے
ماہ جبیں وہ روز لین
سینہ ہے چشمۂ سرور   رقص میں یا کہ موج نور
خاک کا یہ کمال ہے   جلوۂ بے مثال ہے
کاش وہ ہو مرے لئے
مرمریں جسم سر بہ سر   لعل و زمرد و گہر
پھر بھی گداز وہ بدن   نازک و نرم سیم تن
ماہ جبیں وہ روز لین
دھرتی کی جان ہو فدا   دل سے نثار دیوتا
نظروں سے آگ لگتی ہے   شمع وفا سلگتی ہے
کاش وہ ہو مرے لئے

محمد عباس کاظمی نیشاپوری

دو دلوں کی جدائی

جو دو دل ملے تھے جدا ہو رہے ہیں
قیامت پہ وعدے وفا ہو رہے ہیں

نہیں کوئی تدبیر ملنے کی باہم
عبث اس پہ کڑھنا ہے بیکار ہے غم

کریں لاکھ کوشش تو کیا کر سکیں گے
یہ طے ہو گیا ہے نہ اب ہم ملیں گے

جدائی کے کٹ جائیں گے یہ کٹھن دن
خوشی اس کی ہے ہم رہیں پاک باطن

ہجوم بلائیں رہیں گے خوشی سے
جو گذرے گی دل پر سہیں گے خوشی سے

اگر اتفاقاً کہیں پھر ملیں ہم
تو اگلی محبت نہ ظاہر کریں ہم

انھیں دیکھتے رہ گئے چاند تارے
جدا ہو گئے دونوں قسمت کے مارے

کہاں تک دل خستہ اندوہ سہتا
کہاں تک جدا ہو کے اس گلی سے رہتا

مآل محبت تمھیں کیا بتائیں
تباہی کے احوال کیسے سنائیں

اداسی ہے چہرہ پہ بدلی ہے حالت
چھپی جا رہی ہے نگاہوں سے صورت

خواہشوں کے سب قافلے لٹ گئے ہیں
جنھیں چاہتے تھے وہی چھٹ گئے ہیں

تمھاری خوشی پر ہے بس اب جو چاہو
ہمیں موت کی گود سے آ کے لے لو

تلوک چند محروم

محبّت

سراپا اشک غم ہونا، کہ آہ نارسا ہونا
اسی کا نام ہے دُنیا میں اُلفت آشنا ہونا

نظر عہدِ وفا پر صدق سے آٹھوں پہر رکھنا
بدل خدمت گزار دلبرِ رنگیں ادا ہونا

سراسر پیکر جذبات و احساسات بن جانا
عقیدت کیش ہونا، اور اطاعت انتہا ہونا

خیالِ احترامِ حسنِ جاناں میں مگن رہنا
بعجزِ عاشقی خاکِ سرِ راہِ وفا ہونا

سراپا صبر ہونا اور سراپا محض بے صبری
بہت ممتاز ہیں کا دشوار ہے گو ایک جا ہونا

نظر کو اور دل کو صاف رکھنا آزمائش میں
بہ اُمیدِ وفا جینا، پرستارِ جفا ہونا

مولانا امتیاز علی عرشی

حقیقی دولت

غریب کو نہیں کچھ ڈر زوال دولت کا
غریب کو نہیں کچھ خوف کبر و نخوت کا

غریب بن کہ نزارہ نما خدا ہو جائے
مصیبتوں کا جہاں یک قلم فنا ہو جائے

کم و زیاد جو مل جائے اس پہ قانع ہو
خدا سے مانگ وہ شے جو طمع سے مانع ہو

خدا کی حفظ و اماں ہے اگر تجھے درکار
تو شکر کہ وہ شاکر کا خود ہے رہبر کار

وبال دوش ہے ساماں مسافروں کیلئے
ذرا نہ لے اکہ تو خقبیٰ کا خود مسافر ہے

یہاں کی فکر نہ کر جو ملے غنیمت ہے
وہاں ملے کہ حقیقت میں وہی دولت ہے

بشیر احمد طاہر

چوہے سے

کہاں چوہے جاتا ہے رُوٹھا ہوا
ہے مٹی کا گھر تیرا ٹوٹا ہوا

بنایا تھا کیوں تو نے گھر کھیت میں
جو ہل چل کے اب مل گیا ریت میں

چمک دار مخمل سی ہے پوستیں
یہ پوشش ہے خاکستری کیا حسیں

بہت رنج ہے مجھ کو اس کے سوا
کہ جاڑے کا موسم ہے ٹھنڈی ہوا

ترے بال بچے ہیں بے گھر ہوئے
کہاں جائے گا تو ان سب کو لئے

عجب ظلم ہے یہ بھی انسان کا
نہیں جانور پر جو کرتا دَیا

تسلّط ہے شہر و خیابان پر
تسلّط ہے اس کا بیابان پر

زبردست مارے اور رونے نہ دے
ہمیشہ کے گُن ہیں یہ انسان کے

ہمیشہ نظر غیر کے مال پر
کرے نہ کرم غیر کے حال پر

جمع کتنی محنت سے تو نے کیا
یہ سرما کے موسم کا اندوختہ

وہ بل چل کے اب ہو گیا پائمال
کڑاکے کے جاڑے میں یہ تیرا حال

تو اے خانہ برباد کچھ غم نہ کر
یہی حال گذرے ہے انسان پر

جو منصوبے تھے فکرِ چالاک میں
وہ چشم زدن میں ملے خاک میں

ترا حال کچھ اس سے بہتر ہی ہے
خبر آدمی کو نہیں کل کی ہے

تجھے فکر رہتی ہے بس حال کی
اِسے فکر ہے قیل اور قال کی

کبھی رنج ماضی سے بے رو رہا
کبھی فکر فردا میں وہ مبتلا

ارے چھوٹے چوہے تو گھبرا نہیں
بُرا حال کیا آدمی کا نہیں

قلق میرٹھی

اوصاف و اخلاق شتر

اونٹ تو کس قدر ہے نیک و حلیم
مثل اطفال تربیت میں سلیم
خلق کو فیض عام ہے تجھ سے
انتفاع تمام ہے تجھ سے

خلق پاتی ہے تجھ سے جام و نان
تیز گامی ہے تیری نفع رساں
ملک گرم عرب کا ریگستان
نہ تو سایہ نہ آب سرد جہاں

نہیں چلتی جہاں کی گرم ہوا
ہاں مرغ پرند سے اصلا
نہیں وہاں ماندگی سے تو مجبور
ہفتہ ہفتہ چلے نہ ہو کمزور

ریشم و زرو گوھر رخشاں
تحفہ ہائے دمشق و ہندستاں
لائے تو ہر طرف سے گرم عناں
پئے تجار متعال جہاں

تجھ پہ لادے ہیں لوگ بار گراں
رات دن صورت جہاز کلاں

راہ ہفتوں کی اے صبا رفتار
مثل سایہ تو جب کرے ہے گذار

ہووے راکب تر جو ضعف پذیر
راہ کی ماندگی سے اور دل گیر

تو کرے وہ نگاہ مہر انگیز
ہر کنایہ ہو جس کا تسکیں خیز

یعنی منزل وہ آتی ہے اے لو
ایک دن اور بھی چلے ہی چلو

اپنی ہمت کو توڑتے کیوں ہو
پانی آگے ہے چھوڑتے کیوں ہو

اب ہوا کے ہیں بشتر اوصاف
آب کے قرب پر دلائل صاف

الغرض اونٹ تو ہے نیک و حلیم
مثل اطفال تربیت میں سلیم

خلق کو فیض عام ہے تجھ سے
انتفاع تمام ہے تجھ سے

لاکھوں ویرانے اور دشت کبھو
طے نہ ہوتے اگر نہ ہوتا تو

دشت و صحرا و کوہ و ریگستاں
ہے تجھے مثل شاہ راہ رواں

سعید الدین خاں سعید

سونے کی تھال

صحن مندر میں بنارس ملی سونے کی تھال
پشت پر تحریر تھا جلی حرفوں میں حال
لئے رب کی ہے جو اسکا ہے لال
جسکے لئے دل میں ہے بشر کا پیار تا حد کمال
جب پجاری کر چکے اعلان اس انعام کا
کھنچ کے آئے وہ جنھیں کاموں پر اپنے ناز تھا
ان میں سے زاہد رئیس و کش
عالم سخی، فقیہ جب کچھ بھی مذہبی بڑے چھوٹے سبھی
غور سے ہر ایک کا قصہ، پجاری سن چکے
اس ذوق کے اک سال تک جاری رہے
جب سنا ان مذہب نے اک محب قوم کا
مال و زر جس نے قبروں میں کیا تقسیم تھا

سوچ کر حق میں اُس کے فیصلہ اپنا دیا
کہ یہی تھا نیک عافی طرف دریا دل بھلا
ہاتھ میں روح تھمائی تھامی انھوں نے جس گھڑی
سِسّے میں تبدیل فوراً تھال زر کی ہو گئی
چھوٹ کر ہاتھوں سے نیچے جب یہ کچھ دے گر پڑی
منقلب کامل زرِ خالص میں فوراً ہو گئی
یہ کرشمہ دیکھ کر ہر اک ہراساں ہو گیا
مدعی حیرت میں ڈوبا گھورتا سب کو رہا
تین بار اس خادمِ مخلوق کو یہ دے گئی
بات، قدرت کی نظر میں کچھ نہ اس کی جچ سکی
رنج دہ ہر مرتبہ صورت یہی پیدا ہوئی
برق کی تیزی سے سیسہ میں بدلتی وہ گئی
واقعہ سن کر بھکاری جب جمع دریہ ہو گئے
داستاں نظروں سے اک اک کو سناتے بھی رہے
پرند دیکھی اک نے بھی ان کی نظر حسرت بھری
بس نگہ ان کی جمی دستِ طلب ہی پر رہی
دو برس کے بعد آیا ایک دیہاتی وہاں
جس کو ایک معذور کا آیا فکر دردِ نہاں
لے کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں اس نے کہا
میرے بھائی رنج ہمت سے تو سہہ بہرِ خدا

خالق عالم ہے رحمٰن و رحیم و مقتدر
رمز کاموں میں سدا ہوتا اس کا مستتر
کہہ کے سچی بات اٹھا جب وہاں سے وہ غریب
درد لے کر صحن میں آیا امیروں کے قریب
سُن کے قصے جب کیا اس نے ارادہ جانے کا
چہرے سے نمایاں رعب حسنِ قدس تھا
دیکھ کر حلم و تقدس صبر و خدمت کا نشاں
وہ پجاری کر چکے نذر اس کو نذرِ آسماں
گھورنے اس کو لگے سب جب وہ سونے کی رہی
بات سبھی کو مخاطب کر کے اس نے یہ کہی
مرحبا تیری محبت بے نیاز و پاک ہے
ناز ہے جس پر فلک کو تو وہ مشتِ خاک ہے
جھک کے اُس نے تھال پر بوسہ دیا اور کی دعا
یوں عقیدت سے کیا شکرانہ اُس نے خالق کا ادا
رحمت رب روح پر اس کی برستی یوں رہی
روشنی جیسے فلک سے سویرے پھیلتی

اختر جوناگڈھی

گوہر اشک

سرد چلتی تھیں ہوائیں اور اندھیری رات تھی
سو رہی تھیں برف کے بستر پہ کرنیں چاند کی

نازنیں اک، مرقدِ نو بستہ دل دار
بیٹھ کر آنسو بہانے لگ گئی با چشم تر

برف کے مانند قطرہ اشک کا وہ جم گیا
صبح کو سورج کی کرنوں نے اسے چمکا دیا

اتفاقاً اک فرشتے کا ہوا اس پر گذر
دیکھ پایا اس نے وہ اشک درخشاں قبر پر

جھٹ اٹھا کر لے لیا اس نے وہ در بے بہا
اور وہ اس کے تاج سر کے واسطے زینت ہوا

ضامن کنتوری

خواب پریشاں

شب گذشتہ کو بیٹھا ہوا تھا میں تنہا
انیس بزم بجز شمع اور کوئی نہ تھا

کہ دفعتاً ہوا کچھ اور رنگ صحبت کا
جمال شمع کا دھندلا دکھائی دینے لگا

ہوا سے شمع کی لو جھلملاتی جاتی تھی
کرشمے رنگ جہاں کے دکھاتی جاتی تھی

گھڑی، حیات کی گھڑیاں گھٹاتی جاتی
کہ چلتے چلتے ہی ٹن ٹن بجا دیئے گیارا

دماغ پر کیا پھر وا ہمے نے اپنا اثر
ہوا خیال کہ شیطاں کہیں سے آئے نظر

سفید اوڑھے ہوا اک سر سے پیر تک چادر
خموش صورت بت سامنے ہو آکے کھڑا

ابھی یہ دل سے اور مجھ سے باتیں تھیں
ہوا میں کچھ حرکت سی ہوئی نمود وہیں
پھر ایک شکل نظر آئی مجھ کو اپنے قریں
تو ہمارت کو چشم یقیں سے دیکھ لیا

دیا جو غور تو صورت تھی جانی پہچانی
مگر نمود تھی چہرے پہ کچھ پریشانی
مشابہت تھی بہت مجھ میں اس میں یکسانی
کہ وہ بھی میری طرح آفتوں کا مارا تھا

بڑے تپاک سے گھر کی طرح وہ مرد عجیب
اٹھا کے کرسی اک آ بیٹھا جھٹ سے میرے قریب
کہا یہ کان میں جھک کر کہ اے حبیب لبیب
تکلف اب نہ کرو لاؤ ساغر و مینا

قدیم دوست ہو تم میرے اب کھلاؤ کچھ
مجھے پلاؤ برانڈی کہ رم ہو لاؤ کچھ
چڑھاؤ کیتلی اب چائے ہی بناؤ کچھ
گزک کے واسطے کچھ پنچ و کیک تم منگو

زمانہ ہے گزراں عیش کر لو کوئی دم
کسے خبر کہ تم کل کہاں ہو کہاں ہم
کرو جو ہو سکے سامان تم سے بیش و کم
کروں گا میں بھی ہے جو کام میرے کرنے کا

حواس اڑ گئے میرے یہ گفتگو سن کر
کھڑے بدن پہ ہوئے رونگٹیں اور گھوما سر

یہ ڈرتے ڈرتے ڈر نے کہا منہ سے "مہرباں مگر
نیاز مند کو اک کارڈ دیجئے پہلے عطا

یہ سن کے اس نے کہا "کارڈ کا کارڈ ہے کیا؟
ہماری آپ مدت کی آشنائی ہے

ہیں پھر بھی آپ جو تفتیش نام کے درپے
ہزار وحشت و وحشت ہوں میں سنا

سپہر منگا و زیادہ نہیں مجھے فرصت
بس ایک گھنٹہ کی باقی ہے اب مجھے نوبت

کہ بارہ بجتے ہی میں ہونگا آپ سے رخصت
نئے سال نو کو مجھے اپنا جائزہ دینا

یہ سن کے چپ ہوا میں کچھ دیا نہ اس کا جواب
اٹھا کے دیکھی وہیں روزنامچہ کی کتاب

کیا بغور پھر ایام رفتہ کا جو حساب
تو مجھ پہ کچھ بھی سنہ اڑتیس کا فاضل تھا

تمام سال اٹھائی تھی سخت بیماری
کٹی تھی رنج والم ہی میں زندگی ساری

دل و جگر یہ حوادث کے زخم تھے کاری
جناب ہی کی بدولت یہ سب تھا پیش آیا

بگڑ کے میں نے جوش و غیض و نفرت سے
قسم خدا کی میں واقف ہوں خوب حضرت سے
بس آپ جایئے اب اٹھئے میری صحبت سے
گھر اور دیکھئے یاں مجھ سے کچھ نہ پایئے گا

وہ بولا ایسا تو میں نے نہیں کیا ہے قصور
اگر قصور ہوا بھی تو عفو کر دیں حضور
کہ یاد آئیں گی اک دن یہ صحبتیں بھی ضرور
دیا ہے رنج جو کچھ میں نے اب نہ پھر دوں گا

جو دوسروں نے کیا ہے کریں گے وہ تو جناب
خطاب گر نہیں منظور کیوں ہے اتنا عتاب
جڑیں وہ چرچ کا کہتا ہے ہاں نکالو شباب
کدھر ہیں حضرت اڑتیس بج گئے بارا

یہ سن کے میں نے ملازم کو دی صدا "بیرا!"
تو آ کے سامنے حاضر ہوا وہ کہہ کے "سر"
کہا یہ میں نے کہ اس کو نکال دے باہر
پرانا سال یہ کس طرح گھر میں گھس آیا

محمد عثمان عارف نقشبندی

یک گونہ تسلّی

میں جب دنیا کی، قسمت کی نظر میں خوار ہوتا ہوں
تو ٹھکرایا ہوا، تنہائی کے عالم میں روتا ہوں

(۲)

مزا شورِ فغاں، گوشِ فلک پر بے اثر پاکر
ملامت کرتا ہوں خود پر کبھی اپنے مقدر پر

(۳)

مچل جاتی ہیں کتنی خواہشیں کتنی تمنائیں
مجھے یہ حسن مل جائے، مجھے وہ دوست مل جائیں

(۴)

عجب رشک و حسد کی کش مکش میں پھنس گیا ہے دل
مقدر اس کا مل جائے، کمال اُس کا کروں حاصل

نہیں مطلق قناعت اس پہ جو کچھ میں نے پایا ہے
کبھی اس کی تمنّا ہے کبھی اس کی تمنا ہے

(۵)

حقارت خود سے جب ہوتی ہے مجھ کو ان خیالوں میں
تجھے دیکھ لیتا ہوں میں خوشیوں کے اُجالوں میں
زمیں سے، پو کے پھٹتے ہی، خوشی کی لہر سی اُٹھے
ترانے حمد کے پہنچیں در فردوس پر میرے

(۶)

ہے وہ یادوں کا سرمایہ تیری شیریں محبت کا
کہ ٹھکرا دوں، نہ لوں بدلے میں، رتبہ بادشاہت کا

شمیم کرہانی

مکان

اک پہاڑی کی اونچی چوٹی پر
میں بناؤں گا ایک ایسا گھر

جس میں چاروں ہوائیں آئیں گی
اور سندیسے نئے سنائیں گی

آکے بادِ جنوب و بادِ شمال
ڈال دے گی سنہری نیند کی شال

شام کو سیج پر سلائے گی
صبح کو منہ مرا دھلائے گی

مشرقی و مغربی جھونکے
جلد کو میری صاف کردیں گی

اور جب اس گھر میں رات آئیگی
تیرگی چار سمت چھائے گی

جھیل ہوگی سیاہ شب مدہوش
چاند اور پھول چپ ہوا خاموش

تو مرا گھر سماں دکھائے گا
چاند تاروں میں مسکرائے گا

قلق میرٹھی

داستانِ شاہ کینیوٹ

ایک دن کینیوٹ فرزانہ
بخیالات پادشاہانہ
رونق افروزِ تخت تھا اور تھے
اہل دربار گرد پیش کھڑے
تھے خوشامد پہ سب کے سب مائل
تا عنایت ہو شاہ کی حاصل
عرض کرنے لگے کہ بحر رواں
پادشاہ کا ہے تابع فرماں
شاہ چاہے تو موج ہو جنباں
اور نچاہے تو ہو فرد طوفاں
مسکرا کر بہ طنز شہ نے کہا
امتحان شکوہ ہے اولے

سوئے دریا چلی سواری شاہ
اور وہ سارے خوشامدی ہمراہ
تاکہ ان بے تمیز موجوں سے
شاہ کینوٹ کی شکوہ کھلے
حکم والا کی کر کے پابندی
دیں کنارہ پہ بوسہ بانرمی
یہ نہ تھا پادشاہ کا منشا
کہ ہو دریا پہ اس کا حکم اجرا
شاہ کو تھا یقیں کہ ہے بے شک
مالک بحر وہ خدائے فلک
سب نے جانا بہ حیلۂ تعمیل
شہ کا منشا ہے کیجئے ان کو ذلیل
اس گروہ خوشامدی نے لیا
مجرموں کی طرح سروں کو جھکا
الغرض پہنچ کر لب دریا
شاہ کینوٹ نے عصا کو اٹھا
طنطنہ سے کہا کہ باہم جنگ
نہ کریں موجہائے زنگار رنگ

اس نمط حکم تو ہوا اجرا
نہ گھٹا پر وہ جوشِ موج و ہوا

بلکہ برعکس وہاں ہوا سے ہوُا
اور طوفان موج اک برپا

اٹھی پرُغیظ اک موج بلند
نہ رہی حکمِ شاہ کی پابند

دم میں نزدیک تھا شہ و امرا
جملہ بہتے پھریں حباب آسا

پرُغضب ہو کے بادشہ یک بار
متوجہ ہوا سوئے دربار

چشمِ پرُطیش شاہ سے یکسر
تھی یہی بات ظاہر و اظہر

یعنی آتی ہے لازم اس سے کثیر
اک بڑے پادشاہ کی تحقیر

کینوٹ اس فسانہ سے مشہور
ہوگیا تیرے عہد کا مذکور

نام ہی ہو چکا تھا محو ترا
پر جو تجھ سے ظہور میں آیا

اس سے شہرہ رہے گا دایم تر
تاج سے اور عصا سے قایم تر
شاہ فارس نے زور کبر میں آ
پا بہ زنجیر بحر شور کیا
سرکشی موج کی جو گذری شاق
کی ہنٹروں سے اس پہ ضرب وشلاق
اپنے تئیں تو نے خوب پہچانا
شاہ بحر آپ کو نہیں جانا

اختر جوناگڈھی

جگنو

صبح کو جب یہ زمیں و آسماں
شدتِ گرما سے تھے آتش بجاں
تو کہیں آیا نہیں مجھ کو نظر
اور نہ یہ تیرے پُر آتش فشاں
ہے مبدل اب جو رنگِ فلک
اور شعاعوں کا نہیں نام و نشاں
دیکھتا ہوں تجھ کو آتش زیر پا
اور ہوں تیرے لئے ہر دم تپاں
آہ! یہ میری حیات مستعار
اور میری اُلفتِ ناپائیدار
جب کہ دونوں مجھ سے یہ ہو جائیں دور
اور میں ہو جاؤں پریشان روزگار

تب یہ ہلکی سی خوشی کی اک جھلک
ہے درخشاں تجھ میں جو برقی شرار
قلب محزوں اور دل تاریک پر
روشنی ڈالے گا اپنی شمع وار
گو نہ دے گرمی وہ قلبِ سرد کو
دور کر دے گا مگر اس دور کو

تلوک چند محروم

عشق

مطرب خوشنوا! اگر نغمہ غذائے عشق ہے
تان اُڑائے جا یونہی، یہ بھی ادائے عشق ہے
اتنی غذا کھلا اسے پھر نہ زیادہ کھا سکے
جذبۂ شوق مر مٹے، پھر نہ یہ سر اٹھا سکے

ہاں! وہی تان پھر اڑا، طرزِ لطافت آشنا
نغمۂ سامعہ نوا، صورتِ موجۂ صبا
موجِ صبا چلے کوئی جیسے بنفشہ زار میں
دیتی ہوئی شمیمِ گل، لیتی ہوئی کنار میں

بس کر اب اس کو ختم کر اب یہ نہیں ہے دلنواز
آہ! بدل گئی ہے کیا پل میں تری نوائے ساز
تازہ و تیز تر ہے تو، عشق تلوّن آشنا
سارے تخیلات کو تیرے وجود میں فنا

بحر سے کم نہیں ہے کچھ قوت جاذبہ تری
زورِ یم خیال کو جانتی ہے بلا تری

جذبہ ہو یا خیال ہو تجھ میں جو کچھ سما گیا
کتنا ہی سربلند ہو، پست سے پست تر ہوا

تو ہے طلسم سربسر، عشق تلوّن آشنا
تیری ہی ایک ذات ہے نقش تغزات کا

شفیق احمد

رنج و شادمانی

خوشی کے ساتھ میں کچھ دور تک چلا اکثر
وہ باتیں کرتی رہی مجھ سے اپنی راہ تمام
مگر میں ہوش میں کچھ دور کو بھی آ نہ سکا
نہ جانے کیا کہا اس نے، میں کچھ سمجھ نہ سکا

میں غم کے ساتھ بھی کچھ دور تک چلا لیکن
رہا خاموش وہ اک لفظ بھی نہ مجھ سے کہا
رہِ حیات میں جب تک رہا ہے ساتھ اس کا
سکھایا مجھ کو بہت کچھ اسی خموشی نے

بشیر احمد طاہر

بُلبُل

موسم بہار کا تھا، عجب خوش گوار تھا
جنگل کے پتّہ پتّہ کے منہ پر نکھار تھا
کھیتوں میں کر رہے جو کلیلیں چرند تھے
شاخوں پہ غل مچاتے پھدکتے پرند تھے
جھاڑی جہاں حنا کی تھی اک کنج پاس تھا
بیٹھا ہوا اک شاخ پہ بلبل اداس تھا
جنگل جہاں خوشی سے بنا لالہ زار ہے
وہ بولتا ہے پٹ پڑوں اور سوگوار ہے
رنجیدہ اس کو دیکھ ترا تازہ غم ہوا
حالت پہ اس غریب کے کچھ دیدہ نم ہوا
کانٹے کی نوک پر ہے جو چھاتی دھری ہوئی
آواز ہے اس کی درد سے کتنی بھری ہوئی

اے پر بنا تو کیوں اتنا ملول ہے
اس دہر میں تو رنج کسی کا فضول ہے

اتنے چرند ہیں کوئی ہمدرد ہے ترا؟
اتنے پرند ہیں یہ کسے درد ہے ترا

غم خوار تیرے ننھے سو وہ نذرِ اجل ہوئے
اب کون تیرا دوست ہے روتا ترے لئے

اے دوست سن کہ تجھ جیسا میرا بھی حال ہے
سچّے کسی اک دوست کا ملنا محال ہے

شمیم کرہانی

انوکھی دنیا

اک انوکھی نرالی دُنیا میں
یوں سمجھ لو خیالی دنیا میں
اپنی دنیا سے بھی بہت پہلے
لو کہانی سنو کہ دل بہلے
ناچتے تھے ستارے چھم چھم چھم
اور بھینسیں تھرکتی تھیں باہم
گائیں برقع میں منہ چھپاتی تھیں
بچھڑوں کو اوڑھنی اڑھاتی تھیں
برف کے جب پہاڑ گلتے تھے
اونٹ چسٹر پہن کے چلتے تھے

کیا زمانہ تھا کیا کہوں ساتھی
پائجامہ پہنتے تھے ہاتھی
مچھلیاں سڑکوں پر ہٹلتی تھیں
پارک کی گھاس پر ٹہلتی تھیں
پہنے رہتا تھا ہر قلی کمخواب
شاہزادے اٹھاتے تھے اسباب
باز غوغائیوں سے ڈرتے تھے
اور کبوتر شکار کرتے تھے
بلی چوہے سے خوف کھاتی تھی
کتے کو اس کی دم ہلاتی تھی
شیر کا دل دھڑکتا تھا دھک دھک
سارے جنگل کا راجا تھا مینڈک
بکریاں پر لگا کے اڑتی تھیں
دم ہوا میں اٹھا کے اڑتی تھیں
بیل کے سینگ ہو گئے تھے گم
نظر آتا تھا ہر گدھا بے دُم
مرغیوں کے تھے مخملی گدّے
جن پہ دیتی تھیں بیٹھ کر انڈے

شہد کی سی کونین میں تھی مٹھاس
دکھ کو کہتے تھے سکھ تو اس کو پاس
چڑیاں روزانہ دودھ دیتی تھیں
کشتیاں مانجھیوں کو کھینتی تھیں
ریشمی صافہ باندھ کر گھوڑے
شان سے مسندوں پر بیٹھتے تھے
بچے اصلاح کرتے کاپی پر
دوڑا کرتے تھے ریس میں ٹیچر

مخدوم محی الدّین

ہم دونوں

رات ہے، باتیں ہیں، سرگوشی ہے
تو ہے میں ہوں
اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سنّاٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں، تڑپ جاتے ہیں چلاتے ہیں
درِ رفتوں و طلسمات میں پھنس جاتا ہے دل
جسم اور جاں کو کھا جاتا ہے غم
تیشِ غم اور دلِ زار میں پیکار چلی جاتی ہے
گرم گرم آنسو ڈھلک جاتے ہیں رخساروں پر
زندگی یادوں کا مینار بنا لیتی ہے
جو اڑاتا ہے جہاں میں ابدیت کا مذاق
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ بکھر جاتی ہے تاروں بھری رات

چاند چھپ جاتا ہے

رات ہے، باتیں ہیں، سرگوشی ہے
تو ہے میں ہوں ان پرندوں کی طرح سرگوشی
جو دبی سانس میں گاتے ہیں بچھڑنے کے لئے
گیت تاروں بھری راتوں میں جسے ہم نے سنا
دھیمی آواز میں سرگوشی کے انداز میں گایا ہوا گیت
ہاتھ تھرائے، جدائی کی گھڑی آ پہنچی
ہاتھ میں لے لئے میں نے ترے ہاتھ
تاکہ اُن ہاتھوں کو پہچانوں
اُن ہاتھوں سے محبت کرلوں
جسم اور جاں کے رشتوں سے بکھر جانے تک
جاوداں شعلۂ جوالہ کی اک چنگاری
میں نے لے لی ہے ترے ہونٹوں سے
میں جہاں بھی رہوں جس جا بھی رہوں
اپنی آنکھیں تو افق زاروں پہ ملتی ہی رہیں گی کہیں دور
اور دل چپکے سے مل جائیں گے دل ہی دل میں
میرے سیلاب تخیل میں تری یاد اے دوست
اس طرح تیرے گی
صبح دم تیرتا پھرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس

ان ہواؤں میں ترے گیت
وہ بکھرے ہوئے گیت
گونج اٹھیں گے مرے کانوں میں
مرے ہمدم
مرے دوست!

مخدوم محی الدین

بچّے کی دُعا

ایک چھوٹا سا دیا ہو مری ہستی یارب
نور سے اپنے زمانے کو جو روشن کردے

میں جہاں جاؤں مرے ساتھ رہے اس کی ضیا
دشت و کہسار کو یہ وادی ایمن کردے

زندگی کو مری اک پھول بنادے یارب
جس سے مسرور ہوں دل اور معطر ہوں دماغ

اپنی کیاری میں دکھائے جو قناعت کی بہار
گرچہ قدرت نے کیا ہو نہ اسے زینت باغ

ایک نغمہ مری ہستی کو بنادے یارب
غمزدوں کے لئے ہو لذت راحت جس میں

ایسا نغمہ ہو جو اوروں کو قوی دل کردے
گانے والے کے لئے بھی ہو مسرت جس میں

زندگی ہو مری مضبوط عصا کی مانند
جو ضعیفوں کے لئے ایک سہارا ہو جائے
تندرستی کی جو نعمت ہے عطا کی تو نے
اس کی طاقت سے ہر اک کام جہاں کا ہو جائے
زندگانی ہو مری اک دُعا کی صورت
جو تری حمد و محبت کو جہاں میں پھیلائے
میرے اخلاص عقیدت کو ہو وہ رنگ عطا
کہ جو نیرنگیٔ عالم سے نہ پھیکا پڑ جائے

اکبر الہ آبادی

آب لوڈور

وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال
جو انگریز شاعر تھا اک بے مثال

بہ فرمائش دخترِ باتمیز
کہ رکھتا تھا جس کو وہ دل سے عزیز

لکھی اس نے ہے نظم اک ابواب
دکھائی شکل روانی آب

جو بہتا تھا پانی میانِ لوڈور
اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

مناسب جو انگلش مصادر ملے
مقفیٰ کیے ان کے سب سلسلے

یہ جمعیتہ افعال کی خوب کی
کہ درسی بھی ہے اور دلچسپ بھی

یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن
کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن

دکھاؤں روانیِ دریائے فکر
کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر

عجب ہے نہیں ان کی اس پر نظر
کجا میں کجا سودیٔ نامور

سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں
نہیں سہل اس راہ کی منزلیں

میرے پاس سرمایہ کافی نہیں
وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں

زباں میں نہ وسعت نہ ایسا مذاق
ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق

اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط
معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ ذکر کرتا ہوں میں

جو تھیں دقتیں کر چکا برملا
غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا
اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

یہ بنتا ہوا اور تنتا ہوا
ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا
رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں کے روزن زمیں کے مسام
یہ ہے کررہا ہر طرف اپنا کام
ادھر پھوٹتا اور پچکتا ادھر
رُخ اس سمت کرتا کھسکتا ادھر
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا
چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوتے ساحل کو دیتا ہوا
یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا
وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا
یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
اِدھر جھومتا اور مٹکتا ہوا
اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا
بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا

وہ اونچے سروں میں تموج کا راگ
وہ خود جوش میں آکے لانا یہ جھاگ

سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا
تھرکتا ہوا اور رقص کرتا ہوا

ادھر گونجتا گنگناتا ہوا
ادھر خود بخود بھنبھناتا ہوا

لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا
یہ پھٹتا ہوا وہ سمٹتا ہوا

سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا
سرکتا ہوا اور ملتا ہوا

یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا
اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا

یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا
دباتا ہوا اور لچتا ہوا

پھسلتا ہوا ڈگمگاتا ہوا
لچکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا

وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا
وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا

گل و خار یکساں سمجھتا ہوا
ہر اک سے برابر الجھتا ہوا

بہاتا ہوا اور بہتا ہوا
ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
لرزتا ہوا تلملاتا ہوا
بلکتا ہوا بلبلاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا
نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا
اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا
زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا
وہ دھرتی یہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا
وہ چکّر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا
امنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا
سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا
حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا

تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا
شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا

یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں
بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں

وہ سودے کا سیلانِ آبِ لوڑور
یہ بحرِ خیالاتِ اکبر کا زور

برقؔ دہلوی

شہیدِ جفا

دامانِ شب تراوشِ شبنم سے تر ہوا
اوجِ فلک پہ ماہ مبیں جلوہ گر ہوا
زرتار سقف و بام ہوئے کمتر ہال کے
زریں شعاعِ نور سے اک اک شجر ہوا!

زیرِ فلک تھے ساکن بزمِ جہاں خموش
ہنگامہ حیات کا ٹھنڈا ہوا تھا جوش
ہاں اک حسیں، غم کدۂ کمتر ہال میں
یوں گرمِ آہ نیم شبی تھی بصد خروش

او سنگ دل ہوا تری اُلفت کا امتحاں
کس مُنہ سے تو نے دی تھی وفا کی مجھے زباں
کیا اس لئے کہ رنج سے گھل گھل کے میں غریب
دوں شرمناک کُنجِ اسیری میں اپنی جاں

اک کیا ہوا وہ گرمیٔ اُلفت کا اشتیاق
میں ہوں تری عروس دیدۂ فراق
تری بلا سے اب میں جیوں یا کہ جان دوں
پلکیں بھی نم نہ ہوں تری گذرے نہ دل پہ شاق

وہ دن بھی کیا تھے رنج سے حاصل تھا جب فراغ
میں تھی پدر کے خانہ تاریک کا چراغ
تجھ جیسے بے وفا سے پڑا تھا نہ واسطہ
اندیشہ فراق سے دل تھا نہ داغ داغ

تاروں کی چھاؤں اٹھتی تھی نورِ سحر کے ساتھ
ہنستی ہنساتی خندہ گلہائے تر کے ساتھ
رہتی تھی محوِ نغمہ سرائی تمام دن
میں گلعذار بلبل آشفتہ سر کے ساتھ

اچھا جو میرا حسن نہ تھا اتنا دیدہ زیب
جیسی کہ شاہدانِ محل ہیں نظر فریب
کیوں تو نے ڈورے ڈال کے پھیلایا دام عشق
پابند غم کیا مجھے غارت گرِ شکیب

کیوں حرفِ آرزو مرے کانوں میں ڈال کے
دکھلائے سبز باغ فریبِ جمال کے
میری بہارِ حُسن کو وقفِ خزاں کیا
گلچیں عیشِ ازل کی مُرادیں نکال کے

جس دن سے تو نے اپنی نظر سے گرا دیا
غفلت شعار خاک میں مجھ کو ملا دیا
بے نور ہیں کنول، گلِ رخسار زرد ہیں
تو نے بہارِ حسن کو لوکا ٹکا دیا

میری طرح جو ہجر میں جل جل کے جان دے
اس طرح جذبِ شوق اگر بے اثر ہے
گھل جائے غم سے حسن مجسم بھی ہو اگر
طوفاں کی تاب کیا گلِ نوخیز لا سکے

شاہی محل سنا ہے کہ ہے جلوہ زارِ حسن
ہر نازآفریں، ہے وہاں تاجدارِ حسن
حورانِ شرق، جو کہ ہیں صد رشکِ آفتاب
وہ بھی تو ان کے سامنے ہیں شرمسارِ حُسن

کیوں تو نے حسن کا یہ چمن زار چھوڑ کر
ہر گل بجائے خود ہے جہاں زینتِ نظر
مجھ نا شگفتہ پھول پہ ڈالی نگاہِ شوق
میرا جمال ان کے برابر نہ تھا اگر

یوں جلوہ ریز حسن تھا میرا دیہات میں
تاروں کا نور جیسے ہو تاریک رات میں
قسمت جگاتی کاش کسی ہم وطن کی میں
انمول جانتا وہ مجھے کائنات میں

لیکن عجب نہیں مرا خام ہو خیال
شائد نہ ہو کسی کا تو دلدادۂ جمال
ہو کر اسیر آرزوئے تاج زر نگار
مجھ کو غم فراق میں کرتا ہے پائمال

او دشمنِ وفا مگر اُف، کیا گلہ کروں
نخچیر غم ہوں، کیوں نہ میں گھل گھل کے جان دوں
امید عقد ملکۂ انگلینڈ تھی اگر
پھر کس لئے کیا مرے ارماں کا تو نے خوں

تو نے مری ادا پہ کیا دل نثار کیوں
پھر دے کے داغ ہجر کیا سوگوار کیوں
لے کر بہ شوق حلقۂ آغوش میں مجھے
تڑپا رہا ہے، آہ تغافل شعار کیوں

جاتی ہیں جب ادھر سے حسیناں خوش خرام
گن گن کے پاؤں دھرتی ہیں کرتی ہوئی سلام
حسرت سے دیکھتی ہیں مرا ریشمی لباس
کیا جانیں وہ کہ غم سے مرا کام ہے تمام

وہ سادہ لوح مجھ سے سوا خوش نصیب ہیں
میں آشنائے غم وہ خوشی کی حبیب ہیں
کیا جانیں وہ، ہے خندہ و گریہ میں فرق کیا
غم دیدہ بیگمات سے بہتر غریب ہیں

میں سوختہ نصیب ہوں جلنے کے واسطے
گھل گھل کے سوز غم سے پگھلنے کے واسطے
شاخ بریدہ ہوں میں خزاں دیدۂ چمن
میری بہار حسن ہے ڈھلنے کے واسطے

ظالم کیا ہے تو نے یہاں تک حزیں مجھے
تنہائی کا بھی لطف میسر نہیں مجھے
اس غم کدہ میں تیری کنیزانِ شوخ چشم
ہر بات پر کھاتی ہیں چیں برجبیں مجھے

کل شب جو میں ستم زدہ گرم خرام تھی
آئیں صدائیں کان میں کوس رحیل کی
کہنے لگیں وہ اس طرح مجھ دل ملول سے
بیگم قریب ہے ترے انجام کی گھڑی

اس وقت سب جہاں ہم آغوش خواب ہے
میں ہوں شب فراق ہے اور اضطراب ہے
آنسو بھی آہ پوچھنے والا کوئی نہیں
ہاں اک رفیق یہ دل خانہ خراب ہے

رخصت ہوا قرار کلیجہ ہے پاش پاش
کوس رحیل کا ہے وہی شور دل خراش
آتی ہے اب یہی در و دیوار سے صدا
بیگم! اجل رسید بیالیں بہ ہوش باش

اس طرح نہ اسیرِ محن گرمِ آہ تھی
اس غم کدہ میں زار بحال تباہ تھی
لب پر ہجوم نالہ تھا ہر ہر نفس کے ساتھ
سُرخ آنسوؤں کے جوش سے چشم سیاہ تھی

ہونے نہ پایا تھا ابھی دامن سحر کا چاک
ٹوٹا سکوت صبح اٹھا شورِ دردناک
آئیں صدائیں شورش ماتم کی غل ہوا
ایوان کمتر ہال میں کوئی ہوا ہلاک

آثار سوگ کے نظر آئے اِدھر اُدھر
ماتم میں تیں بار بجا موت کا گجر
کر کے طواف غم کدۂ کمتر ہال کا
زاغ و زغن نے شور کیا پھڑپھڑانے پر

غل مچ گیا، دیہات میں کہرام ہو گیا
اجڑے درخت سبز یہ غم عام ہو گیا
دم توڑتی تھی قید محن میں جو نازنیں
وہ بھی تو ان کے سامنے ہیں شرمسار حسن

جاتا نہیں ہے اب کوئی اس غم کدہ کے پاس
بے رونقی سے ہیں در و دیوار بنک اداس
جس روز سے یہ حادثہ جاں گزا ہوا
اب تک ہے کمتر ہال یہ چھایا ہوا ہراس

ہوتے نہیں حسین وہاں محوِ ناز اب
ہے اس جگہ کے سایہ سے بھی احتراز اب
اڑتی ہے گرد جلوہ گل تھا جہاں کبھی
کیا خاک ہو وہاں کوئی نغمہ نواز اب

گریہ کناں ادھر سے گذرتے ہیں رہ نورد
اس حادثہ کی یاد سے اٹھتا ہے دل میں درد
پڑتی ہے کمتر ہال کے برجوں پہ نظر
بے ساختہ لبوں سے نکلتی ہے آہِ سرد

"زمانہ" کانپور اگست ۱۹۱۹ء

عیسی اجیرن صدا

فردوسِ بازیافتہ

بنام کلمۂ ازلی و ابدی
حقیقی مظہر ذات الٰہی

خدا کے ساتھ تھا جو ابتدا سے
نہیں ہرگز جُدا ہے وہ خُدا سے

خُدا ہے وہ کلام پاک و برحق
ازل سے ہے وہی تو حکمت حق

وہ خالق تھا زمیں و آسماں کا
وہ مالک تھا ہمارے جسم و جاں کا

وہی تاریک دُنیا کا ہوا انور
کرتا ہو تیرگی عالم سے کافور

اسی کے فیض سے فردوس کا حال
شیاطین اور انساں کے کل احوال

لکھے تا ہو عدالت حق کی ظاہر
محبت اور صداقت حق کی ظاہر

بتایا گم ہوا فردوس کیوں کر
کہ نافرمانی انسان سراسر
ہلاکت ہوگئی اور سخت آفت
رہا یاں پر بھلا کیا جز مصیبت
مگر فردوس ہم کو پھر دلایا
اس نے جو کہ بیٹا تھا خدا کا
مطیع حکم حق ہردم رہا وہ
کہ تھا انسان بھی اور تھا خدا وہ
اسے شیطان نے تھا آزمایا
قوی تر اپنے سے اس کو ہی پایا
فریب اس کا نہ اس پر چل سکا کچھ
نہ اس کو جز ندامت کے ملا کچھ
شکست فاش کھائی اس لعین نے
بیاباں ہی میں رب العالمیں نے
کیا بار دگر فردوس ظاہر
اسے پائیں جو ہیں ناجی وطاہر
اب اے رُوح خدا جھ پر کرم کر
ہدایت سے تو کر اپنی منور
مسیحا کا بھی تو ہادی ہوا تھا
بیاباں میں اسے تو لے گیا تھا

ظفر اس نے جہاں شیطاں پہ پائی
اور اپنی نیکی کی قدرت دکھائی

کیا اس حال کو ملٹن نے منظوم
ہے جس کی شاعری کی دہر میں دھوم

فضیلت میں تھا یکتائے زمانہ
تھا فن شاعری میں وہ یگانہ

خیالات اس کے اعلیٰ تھے سراسر
وہ تھا نور الٰہی سے منور

تو ملٹن کی طرح میرا بھی ہے نور
تو کر عرفان حق سے دل کو معمور

کروں اس کی طرح میں نظم یہ حال
نہیں عالم میں ہرگز جس کی تمثال

بیان زندگی تو یہ ہی ہے
اسی سے سارے عالم کی خوشی ہے

یہ ہے فردوس تازہ اس زمیں پر
یہ ہے فردوس اول سے بھی بہتر

تھا جب مخلوق کا ہر طرح بدحال
گنہ کے تھے سبب سب زشت افعال

ہر اک جا دہر میں بس تیرگی تھی
شیاطیں کی سراسر بندگی تھی

ہو کچھ تھی روشنی اس کو کیا دور
تھا تاریکی سے عالم سخت مجبور
چراغِ عقل بھی گُل تھا کہیں پر
بجز ظلمت کے کیا تھا اس زمیں پر
نہ مشعل اہل یوناں کی تھی کافی
نہیں روغن رہا تھا اس میں باقی
ہمارے ہند کا بھی یہ ہی حال
تھا کلجگ جس میں ہوتے بد افعالی
یہودی اہل دُنیا ہو چکے تھے
بہت کم اہل دیں باقی رہے تھے
تھا ظاہر میں اگرچہ دین سے کام
فقط باقی رہا تھا دین کا نام
تھی ظاہر اہلِ دُنیا کی ہلاکت
کہ مُنڈلاتی تھی ہر جا پر نحوست
جو تھے ارباب دانش ہر جگہ پر
ہدایت سے خدا کی جو منور
انھیں تھا انتظار منجی دھر
کرے گا جو خدا کا دور ہر قہر
یہودی قوم کے اہل خدا سب
کہا کرتے تھے یہ حق سے کہ اے رب!

مسیحا کو عنایت جلد کر دے
تو اُس کے نور سے خلقت کو بھر دے
نمودار اب تو ایسی باکرہ کر
کہ پیدا اس سے ہو فرزند داور
عمانوئیل ہو اور ہو مسیحا
ہو قائم بادشاہت اس کی ہر جا
کرے وہ تخت داؤدی پہ شاہی
رہے قائم ہمیشہ بادشاہی
کریں باامن سب حق کی عبادت
یکایک دور خلقت سے ہو ظلمت
نہ رومی کی جفا کا نام رہ جائے
خُدا کی بادشاہت خلق میں آئے
ہر و دیسی حکومت جلد ہو دُور
ہو عرفان خُدا سے قوم معمور"
مجوسی بھی اسی کے منتظر تھے
وہ راتوں تاروں کو تھے دیکھا کرتے
ستارہ قومی یعقوبی کا دیکھیں
ہو پیدا مسیحا ہے یہ جانیں
ہمارے باپ دادا منتظر تھے
کہ ایشر کا یہاں اوتار آئے

وہی ہونش کلینک اور پاپ سبھی
ھرے اس سے جگت آنند پائے

یہ ہی تھی انتظاری جب مسیحا
ہوا اس تیرگی میں جلوہ فرما

مگر اس نور کی آمد کے پہلے
تھا بھیجا ایک پیغمبر خدا نے

کرے توبہ کی وہ ہر دم منادی
کہ تھی نزدیک حق کی بادشاہی

وہ تائب لوگوں کو بپتسمہ دیتا
متانت سے ہمیشہ کام لیتا

بہت سے لوگ بپتسمہ کو آئے
کہ اس کی باتوں پر ایمان لائے

ہوا اس وقت عیسیٰ سال سی کا
زمانہ زندگی کی یہ خوشی کا

نجات خلق پر مائل ہوا وہ
ضروری کاموں کا عامل ہوا وہ

یوحنا پاس بپتسمہ کو آیا
نہ خاطر میں وہ ذلت کچھ بھی لایا

ہدایت سے خدا کی اصطباغی
ہوا واقف ز اسرار الہی

شہادت دی کہ برتر اس سے وہ تھا
کہ افضل تھا نہایت اس سے رتبا
نہ تھا وہ کفش برداری کے لایق
ہر اک صورت وہ تھا حد درجہ فایق
تھا کام اپنا اسے دینے کو تیار
کہ تھا منجی وہی عالم کا مختار
شہادت پر ہوئی تصدیق خالق
کہ ہر دم ساتھ تھی توفیق خالق
فلک کا در یکایک کھل گیا تب
نزول روح اقدس بھی ہوا تب
بہ شکل فاختہ روح اس پہ اتری
یہ آواز خدا اسس وقت آئی
"یہ پیارا بیٹا میرا اس سے خوش ہوں"
ہوا شیطان سن کر سخت محزوں
کہ حاضر تھا وہاں پر وہ لعیں بھی
مجسم ساتھ میں تھے بغض وکیں بھی
لگا کہنے کہ "اب وہ وقت آیا
مصیبت بے طرح جو مجھ پہ لایا
یہ ہی اولاد عورت میرے سر کو
کچل ڈالے گا تا ایذا مجھے ہو

کرلے گا بادشاہت میری تاراج
کرے گا دہر میں یہ ہی تو اب راج
ہے بہتر پہلے حملہ اس پہ کردوں
میں اس کے زور کو یک لخت توڑوں
اسے مانند حوا آزماؤں
گنہ میں مثل اس کے میں پھنساؤں
مگر ہے یہ نہایت کار مشکل
مرا ہر وقت ڈرتا اس سے ہے دل
ہے بہتر دوں شیاطیں کو خبر میں
ہوں حیراں اور پریشاں سر بسر میں
چلا یہ دل میں کہہ کے واں سے ملعون
کہ تا وہ کر سکے کچھ ایسا افسوں
رہے قایم ہمیشہ اس کی شاہی
نہ واقع ہو کبھی اس کی تباہی
کیا اعلان تا دربار شاہی
ہوا میں ہو میاں مہر و ماہی
جہاں بادل میں پوشیدہ ہو ہر کام
کہ حاصل ہو سکے تا نیک انجام
فراہم ہوں وزیران ہنر مند
یہ داران ذی شاں چاق و چوبند

مشیرانِ فہیم اب جمع ہوں سب
تدابیر ایسی سوچیں جو ہوں انسب

ہوا دربارِ شاہی اب فراہم
لگے شوریٰ شیاطین کرنے باہم

خطاب ابلیس نے ان کو کیا یوں
بہ صد افسردگی ان سے کہا یوں

"مشیران و وزیران خردمند
ہے جن کی مصلحت کی رائے اور پند

امیران اور نوابان ذی شان
ہوا کے اور اس عالم کے سلطان

ہزاروں سال سے ہے یاں حکومت
اسی دن سے میں لایا جب کہ آفت

گنہ میں پہلی عورت کو پھنسایا
تمھیں سردار دُنیا کا بنایا

مگر تھا دغدغہ اس دن سے مجھ کو
کہیں پیدا نہ وہ فرزندِ زن ہو

سراسر جو کہ کچلے میرے سر کو
نہ معلوم اس سے میرا حال کیا ہو

نہ فتوے اب تلک پورا ہوا وہ
نہ میرے واسطے ایذا ہوا وہ

کہ فتوے دیر میں ہوتے ہیں پورے
بہت دن سامنے حق کے ہیں تھوڑے

مگر نزدیک اب وہ وقت آیا
نہ جانے کیا زیاں اب ہو ہمارا

ہماری سلطنت آزادگی بھی
ہماری اس جہاں کی زندگی بھی

سراسر خطرہ میں ہے دوستو اب
خبر اندوہ کی مجھ سے سُنو اب

کہ ہے اولاد عورت ابن مریم
بڑھاتی دید اس کی ہر زماں غم

ہمارے سرکو شاید وہ ہی کچلے
نہ جانے کیا مصیبت ہم پہ لائے

کہ اب وہ ہوگیا ہے سال سی کا
نہ دل خوش سن کے ہوگا اب کسی کا

مجسم نیکی ہے وہ اور حکمت
ہر اک خوبی میں اس کو ہے فضیلت

کہ مقصد تا بر آئے حق کا اس سے
ہوں اس سے سارے برتر کام پورے

منادی ایک بھیجا ہے خدا نے
مخالف نے ہمارے کبریائے

ہے دعوت اس کی تا ہر ایک آئے
کرے توبہ وہ اور بپتسمہ پائے
کرے وہ بہر عیسیٰ سب کو تیار
کہ تا بیعت کریں اس کی گنہ گار
اسی کو وہ شہنشاہ اپنا مانیں
اسے مختار اعلیٰ سب پہ جانیں
بہت بپتسمہ پانے واں پہ آئے
وہ تائب دل کو اپنے ساتھ لائے
اور ان کے ساتھ خود عیسیٰ بھی آیا
اسے دیکھا تو ڈر دل میں سمایا
نہ مطلب تھا زیادہ پاک ہو وہ
کہ تائب ہو کے چھوڑے عیب کو وہ
کرے حاصل مگر حق کی شہادت
کریں تا ساری قومیں اس کی طاعت
کی حد درجہ نبی نے اس کی تعظیم
فلک نے کی نہایت اس کی تکریم
جونہیں بپتسمہ اس نے اس سے پایا
خدا نے یہ کرشمہ تب دکھایا
کھلا بلّور کا در آسماں کا
نزول روح شکل فاختہ تھا

ندا آئی کہ یہ پیارا ہے بیٹا
اسی سے دل ہمیشہ خوش ہے میرا
ہے انساں اس کی ماں اس میں نہیں شک
ہوا انسان ظاہر یہ ابھی تک
مگر آواز سے ظاہر یہ ہوتا
پدر اس کا ہے مالک آسماں کا
بڑھائے گا اسے درجہ یاں پر
ہمارے سر کو تا کچلے سراسر
یہ ہے وہ جس نے جنت سے نکالا
یکایک قعر دوزخ میں تھا ڈالا
نہایت پر خطر ہے وقت آیا
ہمارے واسطے ہے موت لایا
چلے گا اب نہیں باتوں سے کچھ کام
بچھائیں مکر کا اب ایسا ہم دام
یہیں اس کے سبب نقصان پائیں
ہم اپنی عقل کے جوہر دکھائیں
گنہ میں وہ پھنسے برباد ہو جائے
نہ خلقت میں خدا کی سلطنت آئے
سفر مشکل نہ ایسا جیسا تب تھا
کہ جب کو جا کے آزمایا

ہوئی تھی کامیابی مجھ کو حاصل
مجھے ہو کامیابی اب بھی کامل"

ہوئے سُن کر شیاطیں سب پریشاں
ہوئے سب صید غم اور سخت حیراں

مگر اظہارِ غم کا تھا نہیں وقت
مناسب کام کا تھا بالیقیں وقت

سرانجام مہم شیطاں پہ چھوڑا
بھروسہ ان کا اس پر تھا نہ تھوڑا

کہ انساں کو گنہ میں تھا پھنسایا
جہنم سے انھیں یاں پر تھا لایا

انھیں سردار دُنیا کا بنایا
انھیں تاج اور تخت اس نے دلایا

بنایا خلق کا معبود ان کو
تمامی دھر کا مسجود ان کو

سوئے بیروں چلا شیطان ملعون
جسے تھے یاد لاکھوں مکر و افسوں

مجسم سانپ تھا با مکر اور زہر
تھا عالم کے لئے اللہ کا قہر

کہ تا ابن خدا کو آزمائے
گنہ میں آزما کر وہ پھنسائے

نہ قائم ہونے کے اللہ کی شاہی
وہ لائے دہر پر از حد تباہی
وہ پورا کرنا تھا مقصد خُدا کا
وہی جو تھا ازل سے کبریا کا
کہا جبریل سے ہنس کر خدا نے
علیم و غیب دان و کبریا نے
"تو اے جبریل اور سب قدسی پاک
تعلق جن کا ہے یا عالم خاک
ذرا دیکھو مری قدرت نمائی
اور اس کے ساتھ شیطاں کی تباہی
ہوا بیٹا مرا اب سال سی کا
ہے باعث وہ ہی دُنیا کی خوشی کا
وہی جس کی بشارت تو نے دی تھی
یہ جا کے بات کنواری سے کہی تھی

فردوس بازیافتہ ۱۹۲۲ء

محمد مصطفیٰ احسین

سہراب و رستم

ابتدائی چند بند

اُجالا صبح صادق کا ہوا پیدا ئے مشرق میں
پڑا پردہ کہر کا دھندلا دریائے جیحوں پر
ابھی تاتاریوں کے کیمپ میں چھایا ہے سناٹا
سپاہی سو رہے ہیں سب کنارے رود جیحوں کے
مگر سہراب نے کروٹ بدلتے رات کاٹی ہے
رہیں بے خواب آنکھیں اور دل بے چین بستر پر
اُجالا صبح کے خیمے میں پر جس دم نظر آیا
وہ اٹھا اور جھٹ پٹ شہسواروں کی زرہ پہنی
کمر سے باندھ کر خنجر ہوا باہر وہ خیمے کے
کہر مرطوب تھی ٹھنڈی ہوا تھی پر نہیں پروا
چلا بس جھٹ پٹے میں وہ طرف پیران ویسہ کے
کئے طے اس نے بالآخر وہ کالے رنگ کے خیمے

نظر آتے تھے میدان میں وہ جیسے شہد کے چھتّے
جہاں جیحوں بہا کرتا ہے اکثر وقتِ طغیانی
عموماً گرمیوں میں جب بہے برفاب پامیری
وہ کالے خیموں والا ریگ کا میدان ہو آخر
تو دیکھا اک ٹیلہ ہے ذرا دریا سے کچھ ہٹ کر
گھسیٹی جاتی ہیں یاں کشتیاں گرما کے موسم میں
یہاں ٹیلہ پہ کچّا قلعہ اک اگلے زمانے میں
بنایا تھا کسی نے پر نہیں آثار اب باقی
یہیں پیران ویسہ کا ہوا ہے اب نصیب خیمہ
وہ گنبد لاٹھیوں کا جس پہ تھے پھیلے ہوئے نمدے
رکا سہراب یاں اک بارگی داخل ہوا اندر
کھڑا پھر ہو گیا خیمہ میں جا کر فرش قالین پر
مگر پیران ویسہ جاگ اٹھا اتنی آہٹ سے
معمر آدمی کچھ نیند کے ماتے نہیں ہوتے
سہارے ہاتھ کے سر کو اٹھا کر وہ معاً بولا
"بتا تو کون ہے کتنے سویرے کس لئے آیا
کوئی تازہ خبر ہے یا کوئی خطرہ ہے شبخوں کا؟"
مگر سہراب پہلے پاس بستر کے چلا آیا
کہا "پیران ویسہ میں ہوں مجھ کو جانتا ہے تو
ابھی سورج نہیں نکلا عدو ہے خواب غفلت میں

نہ آنا تھا نہ آئی نیند لیکن مجھ کو بستر پر
رہا بے چین اور کروٹ بدلتا۔ اب یہاں آیا
کہ حکم افراسیابی ہے کہ تجھ سے مشورہ کرلوں
ہمیشہ جس طرح فرزند سے تیرے کیا کرتا
یہ اس کا حکم تھا جب چل رہے تھے ہم سمرقن سے
تمنا میرے دل کی کیا ہے اب تجھ کو بتاؤں گا
تجھے معلوم ہے جب سے کہ آذر پائیجاں چھوٹا
کٹی تاتاریوں میں زندگانی مجھ سپاہی کی!
خوش اسلوبی سے خدمت شاہ کی اور دکھائے ہیں
جوانمردی کے جوہر کمسنی کے بھی زمانے میں
تجھے معلوم ہے جب فاتحانہ شان سے لشکر
لئے پھرتا ہوں عالم میں ہزیمت دے کہ ایراں کو
ہمیشہ ہر لڑائی میں تو مجھ کو جستجو ہر دم
رہا کی ہر بشر کی یعنی میرے باپ رستم کی
توقع بس یہی یعنی کہ ہم بچھڑے ہوئے مل جائیں
پڑے گھمسان کوئی اور ہم دونوں گلے مل لیں
کہ میں نااہل تو کچھ ہوں نہیں جو ننگ رستم ہوں
مگر دل کی تمنا آج تک تو بر نہیں آئی
اب اک منصوبہ سوچا ہے تجھے لازم ہے سن لینا
وہ یہ ہے آج فوجوں کو ذرا آرام لینے دے

کہ سرداران ایراں کو ذرا میں جا کے اکساؤں
کہ سب میں سورما جو ہے وہ مجھ سے دو بدو لڑ لے
جو میں جیتا تو پہنچے گی خبر یہ گوشِ رستم تک
گیا مارا تو پھر مردے کو کیا حاجت عزیزوں کی
لڑے لشکر سے گر لشکر تو ہے وہ جنگ معمولی
بہت سے سورما ہوتے ہیں غرقابِ فراموشی
مگر ہاں دو بدو میں نام بھی ہے اور عزت بھی
یہ جب وہ کہہ چکا پیران ویسہ نے محبت سے
دبایا ہاتھ اس کا آہ کھینچی اور پھر بولا
تری سہراب بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے
کہ سب سردار تاتاری محبت تجھ سے رکھتے ہیں
ہمارے ساتھ شہرت میں ہے تیرا مشترک حصّہ
ہمیشہ دو بدو میں جان کا تیرے ہے اندیشہ
پھر اس پر آرزو اس باپ سے ملنے کی اے ناداں
کہ جس کی آج تک صورت کبھی تو نے نہیں دیکھی
یہ مانا تیرا مقصد کا ترے وصل رستم ہے
کر اس کی جستجو لیکن نہ یوں جنگ آزما ہو کر
ہو موقع امن کا جس دم تو اس کو ڈھونڈ سکتا ہے
مبادا لاش ہو سہراب کی آغوش رستم میں
تلاش اس کی یہاں بے سود ہے وہ یاں نہیں ملتا

زمانہ وہ گیا جب ہم جوان تھے اور جب رستم
رہا کرتا صف اول میں سب میں پیش پیش اکثر
اب اس کا باپ بوڑھا زال اور وہ ملکے رہتے ہیں
الگ دنیا سے ملکِ سیستاں میں چین سے گھر میں
سبب یا تو یہی ہوگا کہ عالم ہے ضعیفی کا
اور اضمحلال کے آثار پیدا ہیں طبیعت میں
یا شاہِ فارس سے شاید ہوئی ہو کوئی ناچاقی
وہاں جا! تو نہ جائے گا یہاں دل میرا کہتا ہے
کہ تیری گھات میں یا موت ہے یا اور کوئی خطرہ
ہمیں تو عافیت مطلوب ہے تو رہ جہاں چاہے
پدر کی جستجو کر امن میں اپنی اجازت ہے
یہاں یوں دو بدو بے فائدہ لڑنا نہیں زیبا
مگر ہاں شیر کے بچے کو کوئی کس طرح روکے
کہاں ہمت کہ کوئی تھام لے رستم کے بیٹے کو
خدا حافظ! اجازت چاہتا ہے تو اجازت ہے
یہ کہہ کر ہاتھ بھی سہراب کا چھوڑا پھر اس کے بعد
اپنے گرم نمدوں والے بستر سے الگ ہو کر
لپیٹا اپنے اعضاء کو اک اونی کوٹ کے اندر
کھڑاؤں پاؤں میں پہنے لبادہ اک بڑا اوڑھا
عصا شاہی ہے دائیں ہاتھ میں تلوار کے بدلے

رکھی پھر سر پہ اک ٹوپی جو تھی بکری کے چمڑے کی
سیہ رنگی چمکدار اون گھنگر والا اگر کوئی
ہلوا یوں الغرض آراستہ پھر اس نے اس کے بعد
اٹھایا پردہ خیمے کا، صدا دی، اور معًا اس کا
مددگار آن پہنچا، اور یہ دونوں بڑھے آگے
ہوا پردہ کہر کا چاک سورج کے نکلتے ہی
کھلا پھر ریگ تاباں پر کشادہ پاٹ جیحوں کا
سواران تتاری اپنے خیموں سے نکل آئے
کھلے میدان میں صف آرا ہوئے وہ حکم ہوماں سے
کہ ہوماں فوج میں ماتحت تھا پیران ویسہ کا
ہنرمند آدمی تھا عین عالم میں جوانی کے
سیہ خیموں سے جب چلنے لگا لشکر سواروں کا
پھرا اک بار گی آنکھوں میں منظر صبح سرما کا
کہ جیسے سارسوں کے دل اڑا کرتے ہیں قزوین میں
اور البرزی علاقے کے جنوبی کوہساروں میں
نکل کر ساحل آرال سے یا دشت بحر خضر
کے ان منجمد بارد علاقوں سے لب دریا
جہاں جنگل بروکے ہیں، وہ بس اڑتے ہوئے یہاں سے
چلے جاتے ہیں ایران کے جنوبی گرم ساحل کو
سماں کھنچا یہی تاتاریوں نے رود جیحوں پر

سوارانِ صفِ اول محافظ خاص تھے شاہی
سروں پر ٹوپیاں چرمی تو ہاتھوں میں بڑے برچھے
قوی ہیکل سپاہی اور اونچی راس کے گھوڑے
یہ تھے دراصل باشندے بخارا اور خیوا کے
شرابی پینے والے گھوڑیوں کے دودھ کی صہبا
پھر ان کے بعد تھے کچھ ترکمانی نیم مست انساں
تکاوی اور سلوری لوگ سرحدِ جنوبی کے
کچھ اطراف کے بھی شامل اور بحرِ خضر کے بھی کچھ
یہ معمولی قویٰ کے لوگ تھے گھوڑے بھی معمولی
تھے قانع اونٹنی کے دودھ پر یا آب سادہ پر
پھر ان کے بعد تھا انبوہ آوارہ سواروں کا
بھروسے کے تو قابل تھے نہیں پھر بھی نمائش تھی
یہ سیحوں کے کنارے فرغنہ کے رہنے والے تھے

(کوہِ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

Saaz-e-Maghrib

(Vol. V)

CONTENTS

On His Blindness

WHEN I consider how my light is spent
Ere half my days, in this dark world and wide,
And that one talent which is death to hide
Lodged with me useless, though my soul more bent

To serve therewith my Maker, and present
My true account, lest He returning chide,—
Doth God exact day-labour, light denied ?
I fondly ask :- But Patience, to prevent

That murmur, soon replies; God doth not need
Either man's work, or His own gifts : who best
Bear His mild yoke, they serve Him best : His state

Is kingly; thousands at His bidding speed
And post o'er land and ocean without rest :
They also serve who only stand and wait.

J. MILTON

The Better Land

"I hear thee speak of the better land:
Thou callest its children a happy band;
Mother! Oh where is that radiant shore?
Shall we not seek it, and weep no more?
Is it where the flower of the orange blows.
And the fire-flies glance through the myrtle boughs?"
"Not there, not there, my child!"

"Is it where the feathery palm-trees rise,
And the date grows ripe under sunny skies ?
Or 'midst the green islands of glittering seas,
Where fragrant forests perfume the breeze,
And strange, bright birds on their starry wings
Bear the rich hues of all glorious things?"
' Not there not there, my child!"

"Is it far away, in some region old,
Where the rivers wander ov'er sands of gold,
Where the burning rays of the ruby shine,
And the diamond lights up the secret mine,
And the pearl gleams forth from the coral strand?–
Is it there, sweet mother, that better land?"
"Not there, not there, my child!"

"Eye hath not seen it, my gentle boy!
Ear hath not heard its deep songs of joy!
Dreams cannot picture a world so fair–

True Love

Lovest thou me for my beauty's sake?
Love me not then.
Love the victorious glittering sun
The fadeless deathless marvellous one.

Lovest thou me for my youth's sake?
Love me not then
Love the triumphant unperishing spring
Who every year new charms doth bring.

Lovest thou me for treasures sake?
Love me not then.
Love the deep the wonderful sea
Its jewels are worthier love than me.

Lovest thou me for my love's own sake?
A sweet then love me.
More than the sun and the spring and the sea
Is the faithful heart I will yield to thee.

Nasturtiums

POIGNANT and subtle and bitter perfume,
Exquisite, Luminous, passionate bloom,
Your leaves interwoven of fragrance and fire
Are Savitri's sorrow and Sita's desire,
Draupadi's longing, Damayanti's fears,
And sweetest Sakuntala's magical tears.

SAROJINI NAIDU

To Blossoms

Fair pledges of a fruitful tree,
Why do ye fall so fast?
You'r date is not so past,
But you may stay yet here awhile
To blush and gently smile,
And go at last.

What, were ye born to be
An hour or half's delight,
And so to bid good-night?
'Twas pity Nature brought ye forth
Merely to show your worth,
And lose you quite.

But you are lovely leaves, where we
May read how soon things have
Their end, though ne'er so brave:
And after they have shown their pride
Like you awhile, they glide
Into the grave.

R. Herrick

God Created All Things

God made the sky that looks so blue,
He made the grass so green,
He made the flowers that smell so sweet,
In pretty colours seen.

God made the sun that shines so bright,
And gladdens all I see;
It comes to give us heat and light,
How thankful should we be!

God made the pretty bird to fly,
How sweetly has she sung!
And though she soars so very high,
She 'll not forget her young.

God made the cow to give nice milk,
The horse for me to use;
I'll treat them kindly for His sake,
Nor dare His gifts abuse.

God made the water for my drink:
He made the fish to swim;
He made the trees to bear nice fruit,
Oh! how should I love Him!

Music When Soft Voices Die

Music, when soft voices die,
Vibrates in the memory–
Odours, when sweet violets sicken,
Live within the sense they quicken.

Rose leaves, when the rose is dead,
Are heaped for the beloved's bed;
And so thy thoughts, when thou art gone,
Love itself shall slumber on.

P. B. SHELLEY

To-day and To-morrow

If Fortune, with a smiling face,
Strew roses on our way
When shall we stop to pick them up?
To-day, my friend to-day.

But should she frown with face of care,
And talk of coming sorrow,
When shall we grieve, if grieve we must?
To-morrow, friend, to-morrow.

If those who have wronged us own their fault,
And kindly pity pray.
When shall we listen and forgive?
To-day, my friend, to-day.

But if stern justice urge rebuke.
And warmth from memory borrow,
When shall we chide, if chide we dare?
To-morrow, friend to-morrow.

If those to whom we owe a debt,
Are harmed unless we pay,
When shall we struggle to be just?-
To-day, my friend, to-day.

But if our debtor fail our hoph
And plead his ruin thorough
When shall we weight his beach of faith ?
To-morrow; friend, tomorrow,

For virtuous acts and harmless joys
The minutes will not stay;
We have always time to welcome them
To-day, my friend, to-day.

But care, resent, angry words,
And unavailing sorrow,
Come far too soon, if they appear,
To-morrow, friend, to-morrow,

(N.B.— Moral of :he poem given in Urdu is to be recited by a third boy)

Never Say Fail

Keep pushing-'tis wiser.
Than sitting aside,
And dreaming and sighing
And waiting the tide,
In life's earnest battle
They only prevail
Who daily march forward
And never say fail.

With an eye ever open.
A tongue that's not dumb,
And a heart that will never
To sorrow succumb,
You'll battle and conquer
Though thousands assail,
How strong and how mighty.
Who never say fail.

Ahead then keep pushing.
And elbow your way,
Unheeding the envious,
And asses that bray;

All obstacles vanish,
All enemies quail.
In the might of their wisdom
Who never say fail.

In life's rosy morning.
In manhood's firm pride,
Let this be the moto
Your footstept to guide :
In storm and in sunshine
Whatever assail,
We'll onward and conquer,
And never say fail,

The Last Conqueror

Victorious men of earth, no more
Proclaim how wide your empires are;
Though you bind-in every shore,
And your triumphs reach as far
As night or day
Yet you, proud monarchs, must obey
And mingle with forgotten ashes, when
Death calls ye to the crowd of common men.

Devouring Famine, Plague, and War,
Each able to undo mankind,
Death's servile emissaries area;
Nor to these alone confined,
He hath at will
More quaint and subtle ways to kill;
A smile or kiss, as he will use the art,
Shall have the cunning skill to break a heart,

J. SHIRLEY

Try Again

'Tis a lesson you should heed,
    Try, try, try again,
If at first you don't succeed,
    Try, try, try again,
Then your courage should appear;
    For, if you will persevere,
You will conquer, never fear,
    Try, try, try again.

Once or twice, though yoo may fail,
    Try, try, try again,
If at last you would prevail,
    Try, try, try again,
If we strive, 'tis no disgrace,
    Though we may not win the race.
What should we do in that case?
    Try, try, try again.

If you find your task is hard,
    Try, try, try again.
Time will bring you your reward :
    Try. try, try again,
All that other people do,
    Why, with patience, should not you
Only keep this rule in view,
    Try, try, try again.

Night

Night is the time for rest;
How sweet, when labours close,
Tother round an aching breast
Thecurtain of repose,
Strench the tired limbs, and lay the head
Upon our own delightful bed !

Spring

SPRING, the sweet Spring, is the years's pleasant king;
Then blooms each thing, then maids dance in a ring,
Cold doth not sting, the pretty birds do sing,
Cuckoo, jug-jug, pu-we, to-witta-woo !

The palm and may make country houses gay,
Lambs frisk and play, the shepherds pipe all day,
And we hear ay birds tune this merry lay,
Cuckoo, jug-jug, pu-we, to-witta-woo!

The fields breathe sweet, the daisies kiss our feet,
Young lovers meet, old wives a-sunning sit,
In every street these tunes our ears do greet,
Cuckoo, jug-jug, pu-we, to-witta-woo!

Spring, the sweet Spring!

T. NASH

Time

The lapse of time and rivers is the same,
Both speed their journey with a restless stream,
The silent pace, with they steal away,
No wealth can bribe, no prayers persuade to stay ;
Al·ke irrevocable both when passed,
And a wide ocean swallows both at last,

Though each resemble each in every part,
A difference stikes at leanth the musing heart;
Streams never flow in vain : where streamins abound,
How laughs the land with varies plenty crowned!
But time, that should enrich the noble mind,
Neglected leaves a drery waste behind,

Cherry-Ripe

THERE is a garden in her face
Where roses and white lilies grow;
A heavenly paradise is that place,
Where cherries grow which none may buy,
Till 'Cherry-Repe' themselves do cry.

Those cherries fairly do enclose
Of orient pearl a double row,
Which when her lovely laughter shows,
They look like rose-buds fill'd with snow:
Yet them nor peer nor prince can buy,
Till 'Cherry-Ripe' themselves do cry.

Her eyes like angels watch them still;
Her brows like bended bows do stand,
Threat'ning with piercing frowns to kill
All that attempt with eye or hand
Those sacred cherries to come nigh,
–Till 'Cherry-Ripe' themselves do cry!

T. CAMPION

She Is Not Fair to Outward View

She is not fair to outward view
As many maidens be;
Her loveliness I never knew
Until she smiled on me
O then I saw her eye was bright,
A well of love, a spring of light.

But now her looks are coy and cold,
To mine they ne'er reply,
And yet I cease not to behold
The love-light in her eye :
Her very frowns are fairer far
Than smiles of other maidens are.

H. COLERIDGE

The Beggar Maid

Her arms across her breast she laid;
    She was more fair than words can say;
Bare-footed came the beggar maid
    Before the king Cophetua,
In robe and crown the king stept down,
    To meet and greet her on her way;
'It is no wonder,' said the lords.
    'She is more beautiful than day.'

As shines the moon in clouded skies,
    She is her poor attire was seen:
One praised her ankles, one her eyes,
    One her dark hair and lovesome mien,
So sweet a face, such angel grace,
    In all that land had never been:
Cophetua sware a royal oath:
    'This beggar maid shall be my queen!

TENNYSON

To Celia

DRINK to me only with thine eyes,
And I will pledge with mine;
Or leave a kiss but in the cup
And I'll not look for wine.
The thirst that from the soul doth rise
Doth ask a drink divine;
But might I of Jove's nectar sup,
I would not change for thine.

I sent thee late a rosy wreath.
Not so much honouring thee
As giving it a hope that there
It could not wither'd be;
But thou thereon didst only breathe
And sent'st it back to me;
Since when it grows, and smells, I swear
Not of itself but thee!

B. Jonson

Rosalynde

LIKE to the clear in highest sphere
Where all imperial glory shines,
Of selfsame colour is her hair
Whether unfolded, or in twines:
Heigh ho, fair Rosalynde!

Her eyes are sapphires set in snow,
Resembling heaven by every wink;
The Gods do fear whenas they glow,
And I do tremble when I think
Heigh ho, would she were mine!

Her cheeks are like the blushing cloud
That beautifies Aurora's face,
Or like the silver crimson shroud
That Phoebus' smiling looks doth grace;
Heigh ho, fair Rosalynde!

Her lips are like two budded roses
Whom ranks of lilies neighbour nigh,
Within which bounds she balm encloses
Apt to entice a deity:
Heigh ho, would she were mine!

Her neck is like a stately tower
Where Love himself imprision'd lies,
To watch for glances every hour
From her divine and sacred eyes:
Heigh ho, for Rosalynde!

Her paps are centres of delight,
Her breasts are orbs of heavenly frame,
Where Nature moulds the dew of light
To feed perfection with the same:
Heigh ho, would she were mine!

With orient pearl, with ruby red,
With marble white, with sapphire blue
Her body every way is fed,
Yet soft in touch and sweet in view:
Heigh ho, fair Rosalynde!

Nature herself her shape admires;
The Gods are wounded in her sight;
And Love forsakes his heavenly fires
And at her eyes his brand doth light:
Heigh ho, would she were mine!

T. LODGE

The Plate of Gold

One day there fell in great Benares's temple-court
A wondrous plate of gold, whereon these words were writ:
'To him who loveth best, a gift from Heaven.'

Thereat
The priests made proclamation; 'At the midday hour,
Each day, let those assemble who for virtue deem
Their right to heaven's gift the best; and we will hear
The deeds of mercy done, and so adjudge..'

The news
Ran swift as light, and soon from every quarter came
Nobles and munshis, hermits. scholars, holy men,
And all renowned for gracious or for splendid deeds.
Meanwhile the priests in solemn council sat and heard
What each had done to merit best the gift of Heaven.
So for a year the claimants came and went.

At last,
After a patient weighing of the worth of all,
The priests bestowed the plate of gold on one who seemed
The largest lover of the race-whose whole estate,
Within the year. had parted been among the poor.
This man, all trembling with his joy, advanced to take
The golden plate–when lo; at his first finger touch
It changed to basest lead! All stood aghast; but when
The hapless claimant dropt it changing on the floor,
Heaven's guerdon was again transformed to shining gold.

So for another twelvemonth sat priests and judged.
Thrice they awarded-thrice did Heaven refuse the gift.

Meanwhile a host of poor, maimed beggars in the street
Lay all about the temple gate, in hope to move
That love whereby each claimant hoped to win the gift.
And well for them it was (if gold be charity),
For every pilgrim to the temple gate praised God
That love might thus approve itself before the test.
And so coins rained freely in the outstretched hands;
But none of those who gave, so much as turned to look
Into the poor sad eyes of them that begged.

And now
The second year had almost passed, but still th plate
Of gold' by whomsoever touched, was turned to lead.
At length there came a simple peasant-not aware
Of that strange contest for the gift of God-to pay
A vow wihin the temple. As he passed along
The line of shrivelled beggars, all his soul was moved
Within him to sweet pity, and the tears welled up
And trembled in his eyes.

Now by the temple gate
There lay a poor, sore creature blind, and shuned by all;
But when the peasant came, and saw the sightless face
And trembling, maimed hands, he could not pass, but knelt,
And took both palms in his, and softly satd: O thou,
My brother! bear thy trouble bravely. God is good.'
Then he arose and walked straightway across the court
And entered where they wrangled of their deeds of love
Before the priests.

A while he listened sadly; then
Had turned away; but something moved the priest who held
The plate of gold to beckon to the peasant. So
He came, not understanding, and obeyed, and stretched
His hand and took the socred vessel. Lo!. it shone
With thrice its former lustre, and amazed them all!
'Son. ' cried the priest, 'rejoice. The gift of God is thine.
Thou lovest best!' And all made answer, 'It is well,
And, onw by one. departed But the peasant knelt
And prayed. bowing his head above the golden plate;
While o'er his soul like morning streamed the love of God.

LEIGH HUNT

A Consolation

When in disgrace with fortune and men's eyes
I alone beweep my outcast state,

And trouble deaf heaven with my bootless cries
And look upon myself and curse my fate;

Wishing me like to more rich in one hope;
Featured like him, like him with friends possest,

Desiring this man's art, and that man's scope,
With that I most enjoy. Contended least:

Yet in these thoughts myself despising,
Happly I think on Thee –and then my state,

Like to the lark at break day rising
From sullen earth sings hymns at heaven's gate;

For thy sweet love remembere'd such wealth brings,
That then I scorn to change my state with kings.

W. SHAKESPEARE

Pleasure vs Sorrow

I walked a mile with pleasure
She chatted all the way,
But I am none the wiser
For all she had to say.

I walked a mile with sorrow
And never a word said she,
But oh! the things I learnt from her
When sorrow walked with me.

NASREEN ALI

Philomel

As it fell upon a day
In the merry month of May,
Sitting in a pleasant shade
Which a grove of myrtles made,
Beasts did leap and birds did sing,
Trees did grow and plants did spring;
Everything did banish moan
Save the Nightingale alone:
She, poor bird, as all forlorn
Leaned her breast up-till a thorn,
And there sung the doleful'st ditty,
That to hear it was great pity.

FIE. FIE. FIE! now would she cry;
TEREU, TERUE! by and by;
That to hear her so complain
Scarce I could from tears refrain;
For her griefs so lively shown
Made me think upon mine own.
Ah! thought I, thou mourn'st in vain,
None takes pity on thy pain:
Senseless trees they cannot hear thee,
Ruthless beasts they will not cheer thee;
King Pandion he is dead,
All thy friends are lapped in lead;
All thy fellow birds do sing
Careless of thy sorrowing:
Even so, poor bird, like thee,
None alive will pity me.

RICHARD BARNFIELD

مطبوعات ولا اکیڈمی

دین یار جنگ زندگی اور کام	برق موسوی	۴-۰۰
سخن در سخن (مجموعۂ رباعیات)	نواب مظفر الدین خاں صاحب	۴-۰۰
افق در افق	؍؍	۸-۵۰
ادراک معنی	طیب انصاری	۹-۰۰
میرا شہر میرے لوگ	؍؍	۵-۰۰
مفہوم القرآن (پارہ ا تا ۹)	کیف بھوپالی (فی پارہ)	۲-۰۰
نگارشات حمایت	کرنل حمایت بیگ	۳-۰۰
وجود و شہود	عطا کلیانوی	۴-۰۰
صحرا کا سفر	راہی قریشی	۳-۵۰
نذرِ خرد	ایس۔ ایس لانبہ	۷-۰۰
میخانہ (مجموعۂ کلام)	میکش حیدرآبادی	۱۰-۰۰
محمد بن عبدالوہاب	محی الدین احمد	[illegible]
اردو الفاظ شماری	حسن الدین احمد	۸۵-۰۰
مقدمہ اردو الفاظ شماری	؍؍	[illegible]
انجمن (سوانحی مضامین کا مجموعہ)	؍؍	[illegible]
جامع العطیات	ضیاء الدین احمد شکیب و حسن الدین احمد	۴۵-۰۰
داستانِ غم (فارسی) طبع دوم	شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا	۲۰-۰۰
تاریخ النوائط حصہ اول	؍؍	۲۰-۰۰

ولا اکیڈمی۔ عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴